فورٹ ولیم کالج
اور
حسنِ اختلاط

ڈاکٹر شہناز نبی

ریڈر، شعبۂ اُردو، کلکتہ یونیورسٹی

سال اشاعت : ۲۰۰۳ء

بار : اوّل

تعداد : ۵۰۰

ناشر : سعید پریمی

کمپوزنگ : بے نظیر عمر

تزئین : تسلیم عارف، موبائل:9339116285

مطبع : کوالیٹی ویکس آفسیٹ پرنٹرز، کولکاتا-۹

قیمت : ۱۵۰ روپے

ملنے کے پتے : عثمانیہ بک ڈپو، لورچیت پور روڈ، کولکاتا-۷۳

سعید پریمی، ۴۶/۶ اے، لنٹن اسٹریٹ، کولکاتا-۱۴

Fort William College Aur Husn-E-Ikhtelat

By : Dr. Shahnaz Nabi

Reader, Deptt. of Urdu, University of Calcutta

87/1, Colllege Street, Kolkata-700 073.

Price : **Rs 150/-**

فہرستِ مضامین

- پیش لفظ ۴
- فورٹ ولیم کالج ۷
- میر ابوالقاسم خاں ۸۸
- حسنِ اختلاط کا تنقیدی جائزہ ۱۰۲
- حسنِ اختلاط (اصل نسخہ) ۱۰۸

پیش لفظ

''حسنِ اختلاط'' میر ابوالقاسم خاں کی تصنیف ہے۔ قاسم نے یہ کتاب ۱۸۰۳ء میں گلکرسٹ کی فرمائش پر لکھی تھی۔ اور وہ بھی اس وقت جب انگریزوں نے کلکتہ میں فورٹ ولیم کالج قائم کیا تھا نیز ہندوستان بھر سے بہترین انشاپردازوں کو ایک ہی چھت کے نیچے اکٹھا کیا تھا تا کہ انگریز افسروں کو اردو سے روشناس کرایا جا سکے۔ اس مقصد کے تحت اردو میں تصنیف، تالیف و ترجمہ کا عمل تیز تر ہوا اور ڈھیروں عربی فارسی وسنسکرت میں لکھے گئے قصے کہانیوں نے بہت مختصر سی مدت میں اردو کا قالب اختیار کر لیا تاہم یہ بات دلچسپی سے خالی نہیں کہ ترجمے کے اس دور میں ابوالقاسم خاں کی یہ تحریر طبع زاد قصے کے طور پر سامنے آتی ہے۔ ہم اس کی کتاب کو ادب کا کوئی بیش قیمت نمونہ ماننے کو تیار نہیں لیکن اس سے انکار نہیں کر سکتے کہ قاسم نے اس تصنیف میں چند تاریخی واقعات کو افسانوی انداز میں کہنے کی جو کوشش کی ہے، وہ خاص ان کا اپنا ہے۔ غالباً ان کا مقصد ایک ایسا نثری نمونہ پیش کرنا تھا جس میں محاورات اور ضرب الامثال کا زیادہ سے زیادہ استعمال کر کے روز مرہ کی گفتگو کا انداز بتایا جا سکے۔

ابوالقاسم خاں کی یہ تصنیف اپنے عہد میں مقبول و معروف نہ ہو سکی اور اس کی وجہ یہ تھی کہ کول برک نے جن دو دیسی ممتحنوں کو اس کتاب کے متعلق رائے دینے کے لئے کہا تھا ان دونوں نے اس کتاب کو غیر معیاری کہہ کر نظر انداز کر دیا تھا اور یہ کتاب محض اسی وجہ سے پچاس روپے کے انعام

سے محروم رہ گئی تھی۔ ہو سکتا ہے کہ آج کے اس دور میں جب روپے کی قیمت انتہائی پستی کو پہنچ گئی ہے ہمارے لئے اس انعام کی کوئی اہمیت نہ ہوتا ہم جس دور میں انعام کی یہ رقم آنکی گئی تھی اس دور کے اعتبار سے یہ ایک معمولی رقم نہ تھی مزید برآں انعام کی سفارش کرنے والا کوئی معمولی شخص نہ تھا بلکہ فورٹ ولیم کالج کے شعبۂ ہندی کا صدر اور اردو کا ایک عظیم اسکالر جان بارتھوک گلکرسٹ تھا۔ قاسم کی اس کتاب کو کیوں لائق توجہ نہیں سمجھا گیا یہ ایک بحث طلب مسئلہ ہے۔ اتنی بات اپنی جگہ طے ہے کہ انعاموں کی اس فہرست میں شامل زیادہ تر کتابوں کے بارے میں ممتحن کی یہی رائے تھی کہ 'مصنف کی زبان ناقص ہے' لیکن اس رائے کے باوجود بیشتر کتابیں انعام کی مستحق قرار پاتی ہیں اور رقم میں تھوڑی سی تخفیف کے ساتھ مصنف کو نواز دیا جاتا ہے۔ صرف تین کتابیں انعام پانے سے رہ جاتی ہیں جن میں سے ایک ''حسنِ اختلاط'' ہے۔

زیرِ نظر کتاب میں میر ابوالقاسم خاں کی انشا پردازی کا جائزہ لینے کی کوشش کی گئی ہے اور مصنف کے قلمی نسخے کی تدوین کر کے اس حقیقت پر سے پردہ اٹھانا مقصود ہے کہ جس دور میں یہ کتاب لکھی گئی اس وقت مصنف کے سامنے اردو نثر کا ایسا کوئی نمونہ موجود نہیں تھا جو مصنف کے لئے تقلید کا باعث بنتا۔ فورٹ ولیم کالج سے غیر متعلق ہوتے ہوئے بھی ابوالقاسم خاں کی خدمات کالج کے دوسرے مصنفین سے کسی طرح کم نہیں۔ یہ کتاب اپنی خصوصیت کے لئے تو لائق توجہ ہے ہی، اس کی اہمیت اس لئے بھی ہے کہ یہ بنگال میں لکھی جانے والی نثر کا ابتدائی نمونہ ہے۔ پتہ نہیں اہلِ علم و ادب نے اب تک اس کی طرف سے اتنی بے توجہی کیوں برتی ہے۔

بہر کیف، بنگال کی اس سرزمین پر جن اہلِ علم حضرات نے اردو ادب کے فروغ کے لئے ابتدائی طور پر کوششیں کیں، ان کی خدمات کا اعتراف نہ کرنا بددیانتی ہوگی۔ تاریخ کے دھندلکوں سے ان کی بازیافت ضروری ہے تا کہ ان کے دور میں ان کے ساتھ جو ناانصافی ہوئی ہے اس کا ازالہ کیا جا سکے اور ان کی تحریر کو اردو کی ادبی تاریخ کا حصہ بناتے ہوئے کڑیوں کے جوڑنے کا کام کیا جا سکے۔ 'فورٹ ولیم کالج اور حسنِ اختلاط' اسی مقصد کے پیشِ نظر لکھی گئی ہے۔ امید ہے اہلِ نظر اس سعی کی داد دیں گے۔

اس کتاب کو راقم الحروف نے تین حصوں میں منقسم کیا ہے۔ پہلے حصے میں فورٹ ولیم کالج

کے قیام اور کالج سے متعلق اور غیر متعلق مصنفین کی خدمات کا جائزہ لیتے ہوئے بنگال میں اردو نثر کی ابتدا سے بحث ہے۔ دوسرے حصے میں میر ابوالقاسم خاں، مصنف 'حسن اختلاط' کی شناخت کی کوشش کی گئی ہے۔ تیسرے حصے میں 'حسن اختلاط' کا تنقیدی جائزہ لینے کے علاوہ اصل نسخہ شامل کر دیا گیا ہے جو ایشیاٹک سوسائٹی آف بنگال کی لائبریری میں قلمی نسخے کی صورت میں موجود ہے۔

اس قلمی نسخے تک پہنچنے میں جنھوں نے میری رہنمائی کی ہے ان میں ڈاکٹر عقیل احمد خصوصی شکریہ کے مستحق ہیں۔ اس کے علاوہ میں ایشیاٹک سوسائٹی آف بنگال، نیشنل لائبریری، مغربی بنگال اردو اکاڈمی لائبریری اور سیرام پور لائبریری کے اراکین کی تہہ دل سے شکر گذار ہوں، جنھوں نے اس سلسلے میں میرے ساتھ بھرپور تعاون کیا ہے اور قدیم ماخذات تک پہنچنے میں میری مدد فرمائی ہے۔ میں اپنے بڑے بھائی پروفیسر شاہد نجن حاجرہ کی بھی بہت مشکور ہوں جنھوں نے میرے ذوقِ علم کو ہمیشہ سراہا اور ہمت افزائی کی۔ خصوصی شکریہ ادا کرنا چاہوں گی مظہر مہدی صاحب کا جنھوں نے حیدر آباد سے مجھے 'حسن اختلاط' کے خطی نسخے کی دوسری کاپی فراہم کی۔

میں اپنی بہنوں کی ممنون ہوں جنہوں نے اس نسخے کی کمپوزنگ کی (بے نظیر عمر) اور پروف ریڈنگ میں مدد کی (نیلوفر نبی)۔

شہناز نبی

۲۵/دسمبر ۲۰۰۳

●●●

فورٹ ولیم کالج

فورٹ ولیم کالج کی بنیاد ۱۸۰۰ء میں کلکتہ میں مارکوئس ولزلی کے ہاتھوں پڑی۔ ولزلی کا مقصد انگلستان سے ہندوستان آنے والے ان انگریز نوجوانوں کی تربیت کرنی تھی جو یہاں سول ملازمت اختیار کرتے تھے اور ہندوستان میں بولی جانے والی کلاسیکی اور جدید زبانوں اور ہندو شاستر و اسلامی فقہ، قوانین ملکی اور تاریخ سے ناواقفیت کی وجہ سے ناقص کارکردگی کا مظاہرہ کرتے تھے۔ ولزلی کا خیال تھا کہ ہندوستان میں برطانوی حکومت کی جڑیں مضبوط کرنے کے لئے ان افسران کا ہندوستانی زبان وعلوم کی تعلیم حاصل کرنا بہت ضروری ہے۔ دراصل اٹھارویں صدی کے شروع سے ہی ایسٹ انڈیا کمپنی کا نظم ونسق دو حصوں میں بانٹ دیا گیا تھا۔

(۱) ملٹری (Military) اور (۲) سول (Civil)

ہسٹنگز نے اپنے دورِ حکومت (۱۷۷۲ء تا ۱۷۸۲ء) میں سول سروس کی خامیوں کو محسوس کیا تھا اور اس نے اصلاح کی کوششیں کی تھیں تاکہ افسروں کو نااہل قرار دینے کے بجائے ان کی تربیت صحیح طور پر کی جائے اور انہیں ایک اچھا افسر بننے میں مدد دی جائے۔ اس کے جانشیں کارنوالس نے بھی اس کمی کو محسوس کیا تھا لیکن مارکوئس ولزلی نے سول افسروں کی باضابطہ ٹریننگ پر زور دیا اور اس مقصد کے لئے ایک کالج کے قیام پر اصرار کیا۔

ولزلی سے بھی پہلے ہسٹنگز نے ہندوستانی زبانوں کی اہمیت کو محسوس کر لیا تھا۔ Spear[1] سے

'پہلا شخص' قرار دیتا ہے جس نے ہندوستانی تہذیب سے واقفیت کو بہتر انتظامیہ کے لئے ضروری قرار دیا تھا۔[1]

کہتے ہیں کہ جب ہیسٹنگز کمپنی کے جونیر گریڈ میں تھا (۱۷۵۲ء) تبھی اس نے اردو زبان سے خاصی واقفیت پیدا کر لی تھی اور فارسی میں ایسی مہارت حاصل کر لی تھی کہ انگریزوں میں اپنی اسی اہلیت کی وجہ سے ممتاز و منفرد نظر آنے لگا تھا۔ ۱۷۸۰ء میں اس نے کلکتہ مدرسہ کی بنیاد ڈالی جس کے پس پشت صرف ہندستانیوں کو تقسیم کرنے کا مقصد کارفرما نہ تھا بلکہ اردو اور فارسی سے اسکا لگاؤ بھی کام کر رہا تھا۔ وہ آکسفورڈ میں ایک فارسی chair قائم کرنے کا بھی خواہش مند تھا۔ کلکتہ میں ایشیاٹک سوسائٹی کا قیام (۱۷۸۴ء) کلاسیکی زبان و ادب سے اس کی دلچسپی کا غماز ہے۔ جدید ہندوستانی زبانوں کا بھی وہ خیر خواہ تھا۔ ۱۷۷۳ء میں جب اس نے پہلی ریونیو کمیٹی بنائی تو اردو اور فارسی جاننے والوں کی تقرری کی۔ اسکے عہد میں چارلس ولکنس (۱۷۵۰ء تا ۱۸۳۶ء)، این۔ بی۔ ہال ہیڈ (۱۷۵۱ء تا ۱۸۳۰ء)، جے۔ ڈنکن (۱۷۵۶ء تا ۱۷۹۴ء) اور ولیم جونس (۱۷۴۶ء تا ۱۷۹۴ء) جیسے علماء وفضلاء موجود تھے جنہوں نے مشرقی علوم و زبان کے فروغ میں اس کا ساتھ دیا۔ ششر کمار داس کا کہنا ہے کہ :

> "They contributed greatly to the smooth functioning of the administration with their linguistic competence and at the same time they created an atmosphere of Oriental studies in India. (2)

غرض ولزلی سے قبل ہیسٹنگز اور کارنوالس دونوں ہی سول افسران کو تربیت یافتہ دیکھنا چاہتے تھے تاہم انہوں نے ان کی تربیت کے لئے کوئی واضح منصوبہ تیار نہیں کیا تھا۔ یہ ولزلی ہی تھا جس نے سب سے پہلے اس خیال کو عملی جامہ پہنایا۔

۳ر جنوری ۱۷۹۹ء میں پبلک ڈپارٹمنٹ سے جاری ایک اعلان نامے (مورخہ ۱۲ر دسمبر ۱۷۹۸ء) کے ذریعہ اطلاع دی گئی کہ پہلی جنوری ۱۸۰۱ء سے کسی بھی ایسے افسر کو آفس کے لائق نہیں سمجھا جائے

1. Spear, P. Oxford History of India, p 513
2. Sahibs and Munshis, Sisir Kumar Das, Orion publications. Rupa & Co. First Pub. 1978.. p2.

گا، جسے ہندوستانی زبان، ہندوستانی قوانین اور اصول وضوابط کی جانکاری نہ ہو۔[1]

فارسی اور ہندوستانی کی واقفیت کسی بھی عدالت میں جج اور رجسٹرار کے آفس کیلئے ضروری قرار دی گئی تھی۔ بنگلہ زبان کی جانکاری بنگال اور اڑیسہ کے ریونیو کلکٹر کے آفس کسٹم یا کمرشیل ریذیڈنٹ یا نمک کے ایجنٹ کے لئے ضروری تھی۔

ہندوستانی کی واقفیت بہار اور بنارس کے آفسوں میں تقرری پانے والوں کیلئے بھی ضروری تھی۔ ہندوستانی میں واقفیت حاصل کرنے کیلئے کمپنی کے چند جونیر سول اہلکاروں کو جان گلکرسٹ کے مدرسہ اورینٹل سیمنری (Oriental Seminary) میں داخلہ لینے کا حکم (۱۷۹۹ء) دیا گیا۔

کمپنی کے اہل کاروں کے لئے تعلیم و تربیت کا کوئی معقول انتظام نہ دیکھ کر ولزلی کے ذہن میں فورٹ ولیم کالج کے قیام کا منصوبہ پروان چڑھنے لگا۔ اسے پتہ تھا کہ انگلستان سے آنے والے پندرہ سولہ سال کے نوعمر افسران زیادہ تر کم تعلیم یافتہ اور ناتجربہ کار ہوتے ہیں۔ ان میں سے اکثر کی نوکری ذاتی تعلقات یا رشوت کے بل پر طے پاتی تھی۔ ۱۷۹۳ء کے چارٹر ایکٹ میں ڈائرکٹروں کو حلف لینے کی ہدایت تھی کہ وہ نوکری دینے کے معاملے میں کسی طرح کی رشوت قبول نہیں کریں گے اور نہ ہی ذاتی تعلقات کو اہمیت دیں گے۔

O'malley کا کہنا ہے کہ :

> ''۱۷۹۳ء کے بعد رشوت خوری پر پابندی عائد ہوگئی۔ ہنری ڈنڈاس جو بورڈ آف کنٹرول کا صدر تھا (۱۷۹۳ء تا ۱۸۰۱ء) ذاتی تعلقات کی بنیاد پر آسامیاں پر کرتا تھا۔''[2]

ولزلی نے ۱۸ر جولائی ۱۸۰۰ء کے ایک خط میں کورٹ آف ڈائرکٹرز کو اپنے منصوبے سے آگاہ کیا۔ وہ پہلے تو برطانوی حکومت کی تعریف میں رطب اللسان ہوتا ہے، اس کے بعد اصل مطلب پہ آتا ہے۔ پیراگراف ۱ میں لکھتا ہے :

> The British possessions in India are now constitute one of the most extensive and populous Empire in

1. Ranking, Bengal Past and Present, vii, 1911, p. 5
2. O'malley, L.S.The Indian Civil Service, London, 1965, p. 229-30

the world. The immediate government of the various provinces and nations composing the empire is principally confided to the European Civil Servants of the East India Company. Those provinces namely Bengal, Bihar, Orissa and Bunaras, the Company's Jagheer in the Carnatic, the northern Sarkars, the Baramuhal, and other districts ceded by the the peace of Seringapatnam in 1792, which are under the more immediate and direrct administration of the European Civil Servants of the Company, are acknowledged to form the most oppulent and flourishing part of India, in which property, life and civil order, and religious liberty are more secure, and people enjoy a larger portion of the benefits, of good government, than in any other country in this quarter of the globe.The duty and policy of the Brirish Government in India therefore require, that the system of confiding the immediate exercise of every branch and department of the Government to Europeans educated in its own service and subject to its own direct control, should be diffused as widely as possible, as well with a view to the stability of our own interests, as to the happiness and welfare of our Native Subjects.(1)

1. Annals of the Collegeof Fort William,compiled by Thomas Roebuck, Garden Reach,Calcutta, 1819.

اس اقتباس کے آخری جملے سے اندازہ ہوتا ہے کہ ولزلی کو اپنی 'ہندوستانی' رعایا کی بھی فکر تھی۔ اس کے بعد وہ پیراگراف ۳۵ میں یوروپی علوم سے واقفیت کے ساتھ ساتھ ان افسران کے لئے ملکی زبانوں اور ہندوستانی قوانین سے واقفیت کو ضروری قرار دیتے ہوئے کہتا ہے کہ وہ ایک مخلوط قسم کی تعلیم کے حق میں ہے۔

"Their education must therefore, be of a mixed nature, its foundation must be judiciously laid in England and the super structure systematically completed in India. (1)

ولزلی نے کالج کے نصاب میں درج ذیل مضامین کی تعلیم کو اہم تصور کیا۔

مشرقی زبانیں : عربی، فارسی، سنسکرت، ہندوستانی، بنگلہ، تلنگی، مرہٹی اور تامل۔

قوانین : اسلامی فقہ، ہندوستانی دھرم شاستر، علم الاخلاق، علم قانون، بین الاقوامی قوانین، قانونِ انگلستان، گورنر جنرل کی کونسل، قلعہ سینٹ جارج اور بمبئی پریسیڈنسی کی حکومتوں کے نافذ کردہ قوانین۔

تجارتی وکاروباری : معاشیات، جغرافیہ اور علم الحساب۔

یوروپ کی جدید زبانیں : یونانی، لاطینی اور انگریزی کلاسیکی ادب۔

تاریخ : قدیم وجدید تاریخ عالم، ہندوستان ودکن کی قدیم وجدید تاریخ۔ طبعی تاریخ

سائنس : علم نباتات، علم کیمیا اور علم نجوم۔ ۲

محمد عتیق صدیقی کہتے ہیں کہ :

"مضامین کی مندرجہ بالا فہرست سے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ ولزلی کالج نہیں بلکہ یونیورسٹی قائم کرنا چاہتا تھا جہاں کمپنی کے نو وارد انگریز سول اور فوجی ملازمین کو مشرقیات سے پورے طور پر روشناس کیا جا سکے تا کہ وہ اپنے فرائضِ منصبی کو حسن وخوبی کے ساتھ انجام دے سکیں۔ ۳

1. Annals of the College of Fort William. para 35.
2. The Calcutta Gazette (Extraordinary). 29 September 1800.
3. گلکرسٹ اور اس کا عہد۔ دوسری اشاعت ۱۹۷۹ء۔ انجمن ترقی اردو ہند دہلی۔ صفحہ ۱۱۳

ولزلی نے کالج کے مقاصد بیان کرتے ہوئے یہ بات صاف کردی تھی کہ وہ مشرقی ومغربی دونوں طرح کی تعلیم چاہتا ہے۔ پچھلے صفحات میں پیراگراف ۳۵ سے ماخوذ اقتباس اس بات کا غماز ہے کہ وہ صرف مشرقی تعلیم حاصل کرنے کے حق میں نہیں تھا۔ شائد یہی وجہ ہے کہ مضامین کی فہرست اتنی طویل ہوگئی ہے، جسے دیکھتے ہوئے عتیق صدیقی نے کہا کہ ولزلی کے ذہن میں کسی یونیورسٹی کا منصوبہ تھا۔ دراصل ولزلی کے نزدیک سول سروس کی سب سے بڑی خامی افسروں کا غیر تربیت یافتہ ہونا تھا۔ وہ اتنی کم عمری میں ہندوستان آتے تھے کہ انہیں یورپی علوم سے بھی کما حقہٗ واقفیت نہیں ہو پاتی تھی اور ہندوستانی زبان وعلوم سے ناواقفیت انہیں مزید ناکارہ ثابت کرتی تھی۔ لہٰذا ایک اجنبی سرزمین پر اپنے فرائض کو خوبی کے ساتھ انجام دینے کے لئے ولزلی کے مطابق مشرقی ومغربی دونوں علوم وزبان سے واقفیت ناگزیر تھی۔

ڈبلو۔ ایچ۔ ہٹن اپنی کتاب ''رولز آف انڈیا'' میں لکھتا ہے کہ :

''کمپنی کے محرر ہندوستان میں سولہ یا اٹھارہ سال کی عمر میں آتے تھے۔ اپنے فرائض کے علم سے قطعاً بے بہرہ ہوتے تھے۔ تاریخ، علم قانون، علم اخلاق اور ان لوگوں کی زبانوں سے جن پر حکومت کرنے آتے تھے، بالکل نابلد ہوتے تھے۔ وطن میں کچھ بھی تعلیم وہ حاصل کرتے تھے، وہ بلا کسی استثنا کے بہت کم اور تجارتی قسم کی ہوتی تھی۔ جب وہ اس عمر کو پہنچتے تھے کہ ان کی تعلیم عمدگی سے نشوو نما پائے اور کچھ پھل لائے تو ان کا لکھنا پڑھنا یک لخت بند کردیا جاتا تھا۔ جب وہ ہندوستان میں آتے تو ان کی ناقابلیت اکثر اوقات انہیں آرام طلبی کی طرف مائل کردیتی تھی اور مطالعہ جاری رکھنے کے لئے ان کے حوصلے بڑھانے کی کوئی تدبیر نہیں جاتی تھی۔ ان نقائص کا علاج بقول ولزلی اعلیٰ قسم کی تعلیم میں تھا جس کی بنیاد علاقانہ طور پر انگلستان میں رکھی جاتی اور اوپر کی عمارت باضابطہ طور پر ہندوستان میں تکمیل پاتی۔''[۱]

انہی باتوں کو اگر ولزلی کے الفاظ میں سنیں تو وہ کچھ اس طرح سول سروس کے نقائص بیان کرتا ہے :

۱۔ ڈبلیو۔ ایچ۔ ہٹن۔ بی۔ ڈی۔ مترجمہ مولوی محمد شوکت صاحب دہلوی۔ ۱۹۳۳ء۔ صفحہ ۸۵۔۸۶

The defects of the present condition of the civil service my be comprised under the following heads. **First,** an erroneous system of education in Europe,confined to commercial and mercantile studies. **Secondly,** the premature interruption of a course of study judiously commenced in Europe. **Thirdly,** the exposed and destitute condition of young men on their first arrival in India, and the want of a systematic guidance and established authority to regulate and control their moral and religious conduct in the early stages of the service. **Fourthly,** the want of a similar system and authority to prescribe and enforce a regular course of study, under which the young men upon their arrival in India might be able to correct the errorso or to pursue and confirm the advantages of their European education, and to attain a knowledge of the language, laws, usages and customs of India together with such other branches of knowledge as are requisite to qualify them for their several stations. **Fifthly,** the want of such regulations,as shall establish a necessary and inviolable connection between promotion in the civil service and the possession of those qualifications requisite for the

due discharge of the several civil stations.It is obvious that an education exclusively European or Indian, would not afford an adequate remedy for such of these defects ....Their education must therefore be of a mixed nature.......(1)

غرض ہندوستان پر بہتر ڈھنگ سے حکومت کرنے کے لئے ولزلی کو ایسے سول افسران کی ضرورت تھی جو مشرقی و مغربی علوم میں طاق ہوں۔ اور اسی مقصد کے تحت کالج کی بنیاد پڑی۔

کالج کی بنیاد ڈالتے ہی ولزلی نے اس کے لئے ایک مناسب جگہ اور بہترین عمارت کی بات سوچنی شروع کر دی تھی۔ ولزلی کا ذہن کالج کے سلسلے میں شروع ہی سے صاف تھا۔ اس نے پہلے تو کاغذی طور پر کالج کے قیام کا اعلان کر دیا۔ اس کے بعد کالج کے اصول و ضوابط مقرر کر ڈالے اور کالج کے لئے مناسب جگہ کی تلاش بھی شروع کر دی۔ وارشنے کا کہنا ہے کہ :

"ولزلی کے منصوبے کے مطابق ہر کام شروع ہوا۔ اٹھارہ ستمبر ۱۸۰۰ء کو پردھان سرکاری منتری جی۔ ایچ۔ بارلو نے میڈیکل بورڈ کو کپتان وائٹ کے ذریعہ کالج کی عمارت بنانے کی نیت سے گارڈن ریچ کا معائنہ کرنے اور وہ جگہ پر فضا ہے یا نہیں یہ معلوم کرنے کے لئے کہا۔ جگہ نامناسب لگی تو دوسری جگہ تلاش کرنے کا بھی حکم تھا۔ ۲۳ ستمبر کو میڈیکل بورڈ کو ایک اور ممبر جے۔ فلیمنگ نے اپنے خط کے ذریعہ گارڈن ریچ کو کالج کیلئے ناقابل بتایا۔ اس لئے ۱۴ اکتوبر ۱۸۰۰ء کو بارلو نے بورڈ آف ریونیو کو گارڈن ریچ میں جتنے کسان رہتے تھے ان کی ایک فہرست تیار کرنے اور انہیں وہاں سے ہٹانے کا انتظام کرنے کو کہا۔ ۲۱ نومبر کو بورڈ آف ریونیو نے سرکاری منتری چوبیس پرگنہ کے کلکٹر کے پاس زمین کی قیمت آنکنے اور کالج کے لئے نئی سڑک بنانے کی خاطر ایک انجینئر کے بھیجے جانے کی اطلاع دی۔" ۲

1. Introduction, Establishment of The College of Fort William, inc. in The Annals of the College of Fort William, by Thomas Roebuck,1819, Calcutta.)

۲۔ لکشمی ساگر وارشنے۔ فورٹ ولیم کالج۔ الہ آباد یونیورسٹی۔ ۲۰۰۰ سمبت۔ صفحہ ۱۷

اس سرعت کو دیکھنے کے بعد اس کا اندازہ تو لگایا ہی جاسکتا ہے کہ کالج کو باقاعدہ طور پر قائم کرنے کے لئے ولزلی کتنا بے چین تھا۔

محمد عتیق صدیقی، عبیدہ بیگم، سمیع اللہ اس کے قیام کی تاریخ ۱۰ جولائی ۱۸۰۰ء مانتے ہیں۔ صدیقی 'انڈیا آفس' کے کاغذات کے حوالے سے لکھتے ہیں کہ :

"ٹیپو سلطان کی شکست و شہادت کے چودہ مہینے بعد ۱۰ جولائی ۱۸۰۰ء مطابق ۴ ساون ۱۸۵۷ سمبت اور ۱۷ صفر ۱۲۱۵ھ کو گورنر جنرل مارکوئس آف ولزلی نے فورٹ ولیم کالج کی باضابطہ داغ بیل ڈالی۔" ۱

لکشمی ساگر وارشنے کے مطابق :

"اپنی یوجنا کو ویوہارک روپ دینے کیلئے وہ اتنے اتاؤلے تھے کہ انہوں نے ۹ جولائی والے ڈائرکٹروں کے نام پتر لکھے جانے کے دوسرے ہی دن ارتھات ۱۰ جولائی ۱۸۰۰ء کو کورٹ کے ڈائرکٹروں کو سوچت کئے بنا کالج استھاپنا کی نیم بلی (ریگولیشن) بھی بنا ڈالی۔ پرنتو گورنر جنرل کی وششٹ آگیہ سے استھاپنا تیتھی میسور کی راجدھانی سرنگا پٹم کے پرتھم وجے اتسو کے انوسار ۴ مئی ۱۸۰۰ء رکھی گئی۔" ۲

تاہم چند دوسری کتابوں میں اس کے قیام کی تاریخ ۱۸ اگست ۱۸۰۰ء بتائی گئی ہے۔ مثلاً ششر کمار داس فورٹ ولیم کے باضابطہ آغاز کے متعلق کچھ یوں لکھتے ہیں :

"The College of Fort William was formally founded on 18th August, 1800. The statutes of the college were framed on that day. But 4, May 1800 was decided to be recognized its day of inception, it being the first anniversary of the British arms at Seringapatam. First term of the College, however commenced from 6 February, 1801." (3)

۱۔ گلکرسٹ اور اس کا عہد، محمد عتیق صدیقی، صفحہ ۱۳

۲۔ فورٹ ولیم کالج، لکشمی ساگر وارشنے، الہ آباد یونیورسٹی، ۲۰۰۰ سمبت، ص ۱۳

۳۔ Shaibs and Munshis, by Sisisr Kr. Das, P. 5-6

مندرجہ بالا اقتباس سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ داسؔ ۱۸؍اگست ۱۸۰۰ء کو کالج کے قیام کی باضابطہ شروعات مانتے ہیں۔ فورٹ ولیم میں قائم کردہ کالج ان کیلئے ایک 'سکالیجیٹ انسٹیٹیوشن' ہے۔ لکھتے ہیں :

He was so eager to start the college that on the day he sent his plan to the court of Directors he founded a collegiate institution at Fort William by a regulation. (1)

W.H.Carey بھی اپنی کتاب میں لکھتا ہے کہ :

The College of Fort William was instituted on the **18th August, 1800,** and the first officers of the institution were as follows :-

Rev. David Brown, **Provost,**

Rev. Claudius Buchanan, A.B., **Vice Provost.**

Professorships

Arabic language and Mohammedan law :

Liutanent John Baillie

Persian Language and Literature : Lieutenant Colonel William Kirkpalrick, Francis Gladwin, and Neil Benj. Edmonstone, Esq.

Hindustanee Language : John Gilchrist, Esq.

Regulations and Laws, & c. : Geo. Hilaro Barlow., Esq.

Greek, Latin and English Classics: Rev. Claudius Buchanan. (2)

۱۔ Shaibs and Munshis, by Sisisr Kr. Das, P. 5-6

۲۔ The Good Old Days of Honorable John Company, by R.Cambray & Co. 1907, P. 406

انکے علاوہ کالج میں درج ذیل پروفیسر، اسسٹنٹ پروفیسر و ٹیچر کی تقرری عمل میں آئی تھی۔

۱۔	ایچ-ٹی-کول بروک	پروفیسر	سنسکرت
۲۔	جان ہارنگٹن	''''	فارسی
۳۔	آئی-ڈبلو-آئی-اوزولی	''''	عربی فارسی
۴۔	جے-ڈبلو-ٹیلر	''''	ہندوستانی
۵۔	اٹکنسن جیمس	اسسٹنٹ پروفیسر	عربی فارسی
۶۔	سیموئیل کولتھارڈ	'''''	''''
۸۔	جان لیڈن	'''''	ہندوستانی
۹۔	لفٹنٹ مارٹن رسل	''''''	''''
۱۰۔	لفٹنٹ ولیم پرائس	''''''	''''
۱۱۔	تھامس روبک	''''''	''''
۱۲۔	ڈی-رڈل	''''''	''''
۱۳۔	ایڈورا سکاٹ وارنگ	''''''	''''
۱۴۔	چارلس اسٹوارٹ	سکنڈ اسسٹنٹ	فارسی
۱۵۔	ڈبلو-ای-میکڈوگل	''''''	ہندوستانی
۱۶۔	ولیم کیری	ٹیچر	بنگلا اور سنسکرت
۱۷۔	جیمس ڈنوڈی-ایل ایل ڈی	''	ریاضیات
۱۸۔	ڈیوپلےسی	''	جدید یوروپی زبانیں
۱۹۔	لمسڈن	''	فارسی
۲۰۔	لفٹنٹ ایٹن (لمسڈن کی جگہ پر)	''	''
۲۱۔	ولیم ہنٹر	''	ہندوستانی
۲۲۔	جیمس موئٹ	''	''
۲۳۔	ریو-پوپزول	''	تامل

ان میں بہت سے ایسے تھے جو بعدازاں ترقی کر کے لیکچر اور اسسٹنٹ پروفیسر سے پروفیسر ہو گئے تھے۔

ہندوستانی شعبے میں درج ذیل حضرات ہیڈ منشی، سکنڈ منشی اور منشی کے عہدے پر فائز ہوئے۔

ہیڈ منشی - میر بہادر علی حسینی

سکنڈ منشی - تارنی چرن متر

منشی - مرتضیٰ خاں۔ غلام اکبر۔ نصر اللہ۔ میر امن۔ غلام اشرف۔
بلال الدین۔ محمد صادق۔ رحمت اللہ خاں۔ غلام غوث۔
کندن لال۔ کاشی راج۔ میر حیدر بخش۔

ان منشیوں کی تعداد میں بعدازاں اضافہ بھی ہوا۔ کچھ رخصت ہوئے تو کچھ نئے چہرے شامل ہوئے۔ اکتوبر ۱۸۰۱ء میں محمد صادق، رحمت اللہ خاں، کاشی راج اور غلام غوث کی جگہ سید جعفر، محمد تقی، مبارک محی الدین اور اسد علی خاں کی تقرری ہوئی۔ ۱۸۰۵ء میں بلال الدین کو کالج سے رشوت خوری کے الزام میں نکال دیا گیا۔

ولزلی نے سول افسران کی اخلاقی تربیت کے پیش نظر عیسائی مذہب کی تعلیمات کا نفاذ بھی ضروری سمجھا۔ اس لئے ۱۰ رجولائی ۱۸۰۰ء کے ریگولیشن میں اس نے یہ بات صاف کر دی تھی کہ پرووسٹ کا چرچ آف انگلینڈ کا پادری ہونا ضروری ہے۔ اس کا یہ بھی کہنا تھا کہ فورٹ ولیم کالج کے قیام کا مقصد صرف مشرقی علوم کی ترویج، سول افسران کی تربیت اور قوانین کا بہتر نفاذ ہی نہیں ہے بلکہ اس خطۂ زمین پر عیسائیت کو برقرار رکھنا بھی ہے۔ داس کہتا ہے:

"In as much as the College of Fort William is founded on the principles of the Christian religion, and is intended not only to promote the knowledge of Oriental literature, to instruct the students in the duties of the several stations to which they may be destined in the government of the British Empire in

India, and to strengthten and confirm, within those possessions the attatchment of the civil servants of the East India Company to the wise laws and constitutions of Great Britain, but also to maintain and uphold the Christian religion in this quarter of globe. (1)

جہاں تک عہدے کا سوال ہے فورٹ ولیم کالج میں صرف یوروپین ہی پروفیسر اور لیکچر کے عہدے پر فائز کئے جاتے تھے۔ پروفیسر کی ماہانہ تنخواہ ۱۵۰۰ روپے اور لیکچر کی ۱۰۰۰ روپے ماہانہ ہوا کرتی تھی۔

پروفیسر جان بیلی کو سب سے زیادہ تنخواہ ملتی تھی, یعنی ۱۶۰۰ روپے ماہانہ۔ اس کے علاوہ ۱۰۰۰ روپے عربی مترجم کی حیثیت سے۔

فورٹ ولیم کالج میں ہندوستانیوں کی تقرری صرف منشی، سرٹیفکیٹ منشی اور چیف منشی کے اعتبار سے کی جاتی تھی۔

۲۹ راپریل ۱۸۰۱ء میں کالج کونسل نے تجاویز پیش کیں کہ درج ذیل درجات اور تنخواہ کے اعتبار سے منشیوں کی تقرری کی جائے:

چیف منشی - ۲۰۰ سو روپے ماہانہ۔

سکنڈ منشی - ۱۰۰ سو روپے ماہانہ۔

ماتحت منشی - ۴۰ روپے۔

اس کے علاوہ certified منشی بھی ہوا کرتے تھے جن کی تنخواہ ۳۰ روپے ماہوار ہوتی تھی۔ منشیوں کا انتخاب لیکچر اور پروفیسر کرتے تھے۔

ششر کمار داس نے اعتراض جتایا ہے کہ انگریز پروفیسر کا عہدہ اپنے لئے رکھتے تھے اور علم و زبان کے ماہر ہندوستانیوں کو منشی کا درجہ دیا جاتا تھا۔ جہاں تک کسی ہندوستانی زبان میں اہلیت کا سوال ہے، گمان اغلب ہے کہ وہ اس وقت تک کسی غیر ملکی کے اندر مشرقی استاد سے زیادہ نہ ہوگی۔

Shaibs and Munshis, by Sisisr Kr. Das, P. 2 -۱

بہت ممکن ہے کہ انگریز یہ عہدہ زیادہ تنخواہیں پانے کے لئے اپنے پاس رکھتے ہوں گے۔ دوسری وجہ یہ تھی کہ درس وتدریس سے زیادہ ان پروفیسروں کو نظامِ تعلیم پر نظر رکھنی پڑتی تھی۔ کیری کہتا ہے :

> The names of Colebrooke, Gladwin, Harington, Gilchrist, Edmonstone, Baillie, Lockett, Lumsden, Hunter, Buchanan, Carey and Barlow all of whom in various branches of tuition, discharged the duties of professors, will vouch the exellence of the instruction imparted, and the advantages enjoyed by the students in that establishment. .... (1)

بقول کیری کالج میں عربی، فارسی اور ہندوستانی میں لیکچر کی ابتدا ۲۴رنومبر ۱۸۰۰ء کو ہوئی۔ اسی دوران کالج لائبریری کی بھی بنیاد ڈالی گئی۔

۶رفروری ۱۸۰۲ء کو کالج کی پہلی میقات کے شروع ہونے کی سالگرہ منائی گئی۔ اسی دن امتحان میں پاس ہونے والوں میں انعامات تقسیم کئے گئے اور اعزازی انعامات بھی دیئے گئے۔ اس دن ۱۸۰۱ء کے دوسرے امتحان کے نتائج آئے تھے۔ ولزلی کی غیر موجودگی کی وجہ سے قائم مقام ویزیٹر (Acting Visitor) کو طالبعلموں کو خطاب کرنا پڑا اور انعامات کی تقسیم کا فریضہ انجام دینا پڑا۔ اسی دن مباحثے (disputations) بھی ہوئے۔ جن موضوعات پر بحث ومباحثہ ہوا، وہ یہ تھے۔

۱۔ ہندوستان میں ایک علمی ادارے کا قیام ملکی اور برطانوی اقوام کیلئے فائدہ بخش ہے۔

۲۔ ایشیائی قوموں میں یوروپی قوموں کی طرح اعلیٰ تمدن کی صلاحیت ہے۔

۳۔ ہندوستان میں ہندوستانی زبان عموماً مفید ہے۔

۸رفروری ۱۸۱۴ء کو گورنمنٹ نے طے کیا کہ کمپنی کے ایسے سول ملازمین کو ۵۰۰۰ روپے کا انعام دیا جائے گا جو فورٹ ولیم کالج سے نکل جانے کے بعد عربی اور سنسکرت میں مہارت کا مظاہرہ کریں گے۔ لیکن کورٹ آف ڈائرکٹرز نے ۲۲رجولائی ۱۸۱۴ء کو یہ اعلان واپس لے لیا۔ ۳۰رمئی

۱۔ The Good Old Days of Honorable John Company, by R.Cambray & Co. 1907, P. 407

۱۸۱۵ء کو طے ہوا کہ ایسے افسران کو ڈگری آف آنرز سے نوازا جائے گا اور بس۔ بالآخر وہ کالج جس کے بند کرنے کی کوششیں ابتداء سے ہی جاری تھیں، ۱۸۵۴ء میں بند ہوگیا۔ تاریخ گواہ ہے کہ ولزلی نے بورڈ آف ڈائرکٹرس کی تمام مخالفتوں کے بعد بھی اس کالج کو زندہ رکھنے کی کیسی کیسی کوششیں کی تھیں۔ عتیق صدیقی لکھتے ہیں :

> ''ویلزلی نے کالج قائم کرنے سے پہلے کورٹ آف ڈائرکٹرس سے نہ تو منظوری ہی لی اور نہ ان کو اپنے منصوبے کی تفصیلات سے مطلع کیا۔ ۱۰رجولائی ۱۸۰۰ء کو کالج کا قیام عمل میں آیا تھا۔ اس کے پانچ ہفتے بعد ۱۸راگست ۱۸۰۰ء کو ولزلی نے ایک مختصر سے خط کیساتھ اپنا طویل نوٹ، جو کالج کے قیام کے وقت اس نے لکھا تھا اور کالج کے آئین وضوابط کی نقل کورٹ آف ڈائرکٹرس کے صدر کے پاس بھیج دی....کورٹ آف ڈائرکٹرس نے ۲۷۔ جنوری ۱۸۰۲ء کے مراسلے میں کالج کو فوراً توڑنے اور گلکرسٹ کے مدرسے کی تجدید کرنے کا حکم صادر کردیا۔''[۱]

ولزلی اس خط کو پاکر بے حد ناراض ہوا۔ لیکن کمپنی نے صاف لفظوں میں لکھ دیا تھا کہ کمپنی پہلے سے ہی قرض کے بوجھ تلے دبی ہے۔ اس کالج کے اخراجات اٹھانے کی ہمت اس میں نہیں ہے اس لئے بہتر ہوگا کہ گلکرسٹ کے پہلے مدرسے 'اورینٹل سیمینری' کی تجدید کرکے افسران کی تعلیم وتربیت کا انتظام اسی میں کیا جائے۔ مندرجہ بحث سے یہ بات صاف ہوجاتی ہے کہ فورٹ ولیم کالج کے قیام میں بورڈ کو ابتدا ہی سے کوئی دلچسپی نہیں تھی۔

ولزلی نے ہمت نہیں ہاری۔ ۵راگست ۱۸۰۲ء کو اس نے ایک خط رائٹ آنریبل دی آرک آف ڈارٹ متھ کو ایک خط لکھا اور اس کے ساتھ وہ خط بھی منسلک کردیا جو اس نے کورٹ کو لکھا تھا اور جس میں کالج کو بند کرنے کے بدنتائج کی طرف اشارہ کیا تھا۔ اس طرح انگلستان میں لوگ ولزلی کے ہم خیال بن گئے اور بورڈ آف کنٹرول کالج کو جاری رکھنے پر غور وخوض کرنے لگا۔ چارلس گرانٹ نے تجویز پیش کی کہ کالج کو مکمل طور سے بند کرنے کے بجائے محدود طور پر چلایا جائے۔ یہ تجویز سبھوں کو پسند آئی اور ڈائرکٹروں نے ۲رستمبر ۱۸۰۳ء کو ایک مراسلے کے ذریعہ کسی دوسرے

۱۔ گلکرسٹ اور اس کا عہد، محمد عتیق صدیقی، صفحہ: ۱۱۶-۱۱۹

آرڈر کے آنے تک کالج کو جاری رکھنے کا حکم دیا۔

۱۵ راگست ۱۸۰۵ء کو ولزلی استعفادے کر انگلستان روانہ ہو جاتا ہے۔

ایسا ہی ایک تازہ گلکرسٹ اور کالج کونسل کے درمیان تھا۔ اسے کتابوں کی طباعت و اشاعت سے روکا جاتا تھا۔ مزید برآں عملے اور اخراجات میں ہر طرح سے کٹوتی کر کے شعبوں کو مختصر کر دیا گیا تھا۔ بر طرفی کے ذریعہ منشیوں کی تعداد کم کر دی گئی تھی۔ ہندستانی مصنفین کو انعامات دینے کے سلسلے میں بھی کنجوسی کی جاتی تھی۔ ان حالات میں گلکرسٹ بھی ۲۳ رفروری ۱۸۰۴ء کو استعفیٰ دے کر انگلستان روانہ ہو گیا تھا۔ گلکرسٹ کے بعد ہندوستانی شعبے کی ذمہ داری سینئر اسسٹنٹ ہونے کے ناطے موئٹ کے سرآ پڑی تھی۔

ادھر انگلینڈ میں ہیلی بری کالج قائم کر دیا گیا تا کہ افسران کو تعلیم یافتہ بن کر ہندوستان بھیجا جائے۔ ان کا خیال تھا کہ ہندوستان کی سرزمین پر قدم رکھنے سے پہلے ہی ان افسران کو مشرقی زبان وادب اور مشرقی علوم سے آگاہ ہو جانا چاہئے تھا۔ اس کالج کے قیام کے بعد کلکتے کی سرزمین پر علم و ادب کی روشنی بکھیرنے والے فورٹ ولیم کالج کی چمک ماند پڑنے لگی۔ موئٹ کے استعفے (۳ر فروری ۱۸۰۸ء) کے بعد ولیم ٹیلر ہندوستانی شعبے کے نئے صدر اور پروفیسر بنے۔ اسی زمانے میں ہندی اردو میں تفریق کی بنیاد پڑی۔

نومبر ۱۸۲۳ء میں ٹیلر کی جگہ پرائس نے لی۔ ادھر لیسٹر اسکوئر میں اورینٹل انسٹیٹیوٹ قائم کر کے گلکرسٹ کو وہاں پر درس وتدریس کی ذمہ داری سونپی گئی۔ اس طرح دھیرے دھیرے فورٹ ولیم کالج، کلکتہ کی اہمیت گھٹتی گئی۔ یکم جون ۱۸۳۰ء سے پروفیسروں اور منشیوں کے عہدے ختم کر دیئے گئے۔ ۲۴ رجنوری ۱۸۵۴ء کو لارڈ ڈلہوزی کے عہد حکومت میں کالج کا مکمل طور پر خاتمہ ہو گیا۔

کالج بند ہو جانے کے بعد سے انگریز افسران کا ہندوستان وارد ہونے کے بعد رائٹرس بلڈنگ میں آنے اور اقامت پذیر ہونے کا سلسلہ ختم ہو گیا۔ اس سے سالانہ ایک لاکھ ستر ہزار روپئے کی بچت ہوئی۔ اس کے بعد آنے والے سول افسران کو سیدھے اس علاقے میں بھیج دیا جاتا، جہاں ان کی تقرری ہوا کرتی تھی اور ہندوستانی زبان سمجھنے کے لئے انہیں منشی فراہم کر دئے جاتے تھے۔ یہ نیا انتظام مشرقی زبانوں سے انگریزوں کی دلچسپی پر خاصہ اثر انداز ہوا۔ بالخصوص اردو دوستی

اور اردو نوازی میں کمی آنے لگی اور اردو یا دوسری مشرقی زبانوں کے سیکھنے کا رجحان کم ہونے لگا۔

فورٹ ولیم کالج کی عمارت

فورٹ ولیم کالج رائٹرس بلڈنگ میں واقع تھا۔ بقول کیری ۱۷۸۰ء تک یہ عمارت تجارتی فروغ کے لئے مشہور تھی۔ ۱۸۰۰ء میں یہاں کالج قائم کیا گیا۔ لکھتا ہے :

.......Fort William College was located on its establishment in 1800. The two buildings were connected by a gallery that ran across the street. (1)

رائٹرس بلڈنگ کے کمروں کی تفصیلات اسی کی زبانی سنئے :

''عمارت کے سامنے والے حصے میں یونانی طرز کے تین مثلث بنے تھے۔ یہ ستونوں پر استادہ تھے جو خوبصورت برآمدے بناتے تھے۔ مرکز میں رہائش گاہ کے چار دروازے کھلتے تھے، جو کالج کے استعمال کے لئے بہت مناسب تھے۔ نچلی منزل پر چار لیکچر روم تھے اور دوسری منزل پر کالج کی لائبریری تھی جو چار کمروں میں پھیلی تھی۔ ہر کمرہ ۳۰×۲۰ کا تھا۔ اوپری منزل پر ایک بڑا ہال ۶۸×۳۰ کا تھا جو امتحان گاہ کے طور پر استعمال کرنے کیلئے بنایا گیا تھا۔ عمارت کے ہر مثلث کے سرے پر سکریٹری اور ایک پروفیسر کے رہنے کا انتظام تھا۔ درمیان میں گیارہ عمارتیں تھیں جو طالب علموں کے رہنے کے کام آتی تھیں۔ ۲''

کالج لائبریری

کالج میں ایک شاندار لائبریری بھی تھی۔ ششر کمار داس کا کہنا ہے کہ لائبریری کی بنیاد ۱۸۰۰ء کے اواخر میں پڑی۔ کالج کے پرووسٹ ڈیوڈ براؤن نے کلکتہ گزٹ (۵ رنومبر ۱۸۰۰ء) میں ایک نوٹس جاری کی جس میں پبلک سے چندے کی اپیل کی گئی تھی نیز کالج لائبریری کو کتابیں بطور عطیہ دینے کی گذارش کی گئی تھی۔ داس نے Home Micellaneous, 656, pp 143-146,

۱- The Good Old Days of Honorable John Company, by R.Cambray & Co. 1907, P. 151

۲- ایضاً

letter dt. 26, Sept,1818. کے حوالے سے لکھا ہے کہ ۱۸۱۸ء میں جب اے۔ لوکٹ لائبریرین تھے تو انہوں نے ایک خط میں لکھا تھا کہ پہلے یہ لائبریری کالج کے طالب علموں کے استعمال کیلئے عوامی چندے سے تیار ہوئی تھی۔ اس کے بعد ۱۸۰۵ء میں پرووسٹ کے اختیار میں دیدی گئی۔ ایک سکریٹری، ایک مقامی اسسٹنٹ اور دو دفتری لائبریری کا کام کرتے ہیں۔

اس لائبریری میں کتابیں ہدیہ کرنے والوں کے نام کا پتہ نہیں چلتا لیکن کتابیں مقامی لوگوں سے لی گئی تھیں اور باقی سرنگاپٹم میں ٹیپو کی شہادت کے بعد اس کی لائبریری سے اٹھا کر ۱۷۹۹ء میں کلکتہ لائی گئی تھیں۔ کیرّی کہتا ہے :

"On the 4th May, 1799. Seringapatam as taken by assault. Tippoo Sultan fell in the battle; two of his sons and many of the principal sirdars falling into our hands as prisoners. A very copious and curious library was found in the fortress of Seringapatam, the books re in chests, each having its particular wrapper, and generally in good preservation. Some were very richly adorned and illuminated, in style of the old Missals found in monastaries. The collection was very large, and consisted of thousands of volumes, and must have proved a very great acquisition to Europe of Oriental history and literature. (1)

ان میں بہت سارے مخطوطات تھے جنکا استعمال بھی نہیں کیا گیا تھا۔ چارلس اسٹوارٹ نے بعد میں انکا کیٹلاگ تیار کیا۔ اسٹوارٹ کی نوکری اس وقت تک بحیثیت اسسٹنٹ پروفیسر (فارسی)

۱- The Good Old Days of Honorable John Company, by R.Cambray & Co. 1907, P. 407

کے ختم ہو چکی تھی، اس لئے اس نے اس کام کیلئے ۳۰۰ روپے ماہانہ تنخواہ کے طور پر طلب کئے۔
۵/جون ۱۸۰۵ء کے ایک dispatch کے ذریعہ کورٹ آف ڈائرکٹرز نے لندن میں مشرقی مخطوطات کی ایک لائبریری قائم کرنے کا ارادہ ظاہر کیا اور حکم دیا کہ ٹیپو سلطان کا ذخیرہ لندن روانہ کر دیا جائے۔ سکریٹری کو ہدایت کی گئی کہ ہندوستان بھر سے نادر اور بیش قیمت مخطوطے تلاش کر کے لندن میں قائم ہونے والی لائبریری کے لئے حاصل کئے جائیں۔ کالج ریکارڈ سے پتہ چلتا ہے کہ بخانن نے اس سلسلے میں کافی دلچسپی دکھائی تھی اور تیلگو، کنڑ اور دیگر زبانوں کے مخطوطات میسور سے خریدے تھے۔ بخانن کو چین بھی گیا تھا اور کچھ Hebrew مخطوطات کا مطالعہ بھی کر آیا تھا۔ ۱۸۰۹ء میں لمسڈن نے عربی مخطوطات کی فہرست تیار کی تھی۔

۱۸۱۸ء تک لائبریری میں ۸۳۴۱ کتابیں تھیں۔ یہ کتابیں مختلف موضوعات پر تھیں مثلاً تاریخ، سفر نامہ، قانون، وحدانیت، قواعد، کلاسیکی ادب، عیسائیت اور مشرقی ادب وغیرہ۔ ذیل کی فہرست سے کالج میں موجود مخطوطات کی تعداد کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔ یہ تعداد لوکٹ کے خط مورخہ ۲۶/ ستمبر ۱۸۱۸ء سے دستیاب ہوئی ہے۔

قرآن کی کاپیاں	-	۵۵
قرآن کی تفاسیر	-	۴۸
اسلامی فقہ	-	۱۳۲
دینیات	-	۲۱۳
مابعد الطبیعات	-	۳۴۰
قواعد	-	۱۰۷
فن خطابت	-	۳۷
منطق	-	۳۳
فلسفہ	-	۳۵
شاعری	-	۳۴۵
شرحیں	-	۲۶

کہانیاں	-	۱۰۰
تاریخ (عربی میں)	-	۲۱۸
اسلامی قانون	-	۱۶۳
حساب	-	۴۲
لغات	-	۶۰
ادویات	-	۱۰۰
ہندی مخطوطات	-	۱۵۰
ترکی، پشتو، پنجابی مخطوطات	-	۱۴
سنسکرت مخطوطات	-	۶۴۷
کل تعداد		**۲۹۹۰**

کالج کے ریکارڈ کے مطابق لائبریری میں ۲۹۹۴ مخطوطات تھے لیکن درج بالا فہرست سے ۲۹۹۰ حاصل ہوتا ہے۔ مطبوعہ کتابوں میں ۳۵۷۶ نصابی کتابیں تھیں۔ کتابوں کی کل تعداد ۱۱،۳۳۱ تھی۔ گرچہ لوکٹ کے مطابق ۱۱،۳۳۵ تھیں۔ (بحوالہ ششر کمارداس)

اس کے علاوہ کالج کے پروفیسروں کی ذاتی لائبریریاں تھیں۔ بیلی، لیڈن، ایلفنسن کی لائبریریاں کافی اچھی تھیں۔ انیسویں صدی کی تیسری دہائی میں کالج میں نیپالی مخطوطات کی تعداد ۴۷ تھی اور تبتی کی ۵۳۔ (بحوالہ ششر کمارداس)

۲۱ر دسمبر ۱۸۲۴ء کو ولیم کیری نے کالج کو بتایا کہ Mr. Hodgen جو کاٹھمنڈو میں سول سروس میں تھے، نے مذہبی اور ادبی کتابوں کا اچھا خاصہ ذخیرہ جمع کیا ہے۔ اس میں ہمالہ کے پہاڑی سلسلوں میں رہنے والوں کا ادب شامل ہے۔ کیری نے کالج کو کتابیں اور مخطوطات خریدنے کا مشورہ دیا۔ کالج نے فوراً پیش قدمی کی۔ (بحوالہ ششر کمارداس)

کالج میں یونانی اور لاطینی زبان کی کتابیں تھیں۔ کالج لائبریری کے دو شعبے تھے۔
(۱) یوروپی اور (۲) مشرقی۔

مشرقی سیکشن کے لئے ایک مقامی شخص کو ۴۰ر روپے ماہوار پر رکھا گیا تھا۔ اس کے اسسٹنٹ کو ۲۰ر روپے ملتے تھے۔ دفتریوں کی تنخواہ ۱۴ر روپے تھی۔ یوروپین سیکشن میں ایک اسسٹنٹ مقامی ہوتا تھا۔ موہن پرساد ٹھاکر نامی ایک عالم فاضل شخص کو اکتوبر ۱۸۰۷ء میں یورپی سیکشن میں نوکری دی گئی۔ انہوں نے ۱۸۱۰ میں ایک بنگالی فرہنگ اور ۱۸۱۱ء میں ایک بنگالی لغت ترتیب دی تھی۔ ۱۸۱۶ء میں کہانیوں کا انتخاب چھاپا۔ ان کے علاوہ کسی دوسرے ہندوستانی کا نام کالج کے لائبریرین کے طور پر نہیں آتا۔ جب ٹھاکر ۱۸۱۸ء میں کالج سے رخصت ہوئے تو مسٹر وارڈ نے کالج کے اسسٹنٹ لائبریرین کا عہدہ سنبھالا۔ روبک کا کہنا ہے کہ منشی غلام حیدر مشرقی سیکشن میں اسسٹنٹ لائبریرین کے عہدے پر ستمبر ۱۸۰۱ء میں فائز کئے گئے تھے لیکن کالج ریکارڈ سے اس کا پتہ نہیں چلتا۔ ہندوستانی سیکشن میں تقرری پانے والے افراد کے ناموں کی فہرست سے پتہ چلتا ہے کہ کسی غلام حیدر کی تقرری کالج میں ہوئی تھی لیکن اس کی تقرری کی تاریخ یکم مئی ۱۸۴۴ء ہے۔ ہوسکتا ہے کہ یہ کوئی دوسرا غلام حیدر ہو۔ مولوی کریم الدین کی تقرری یکم اکتوبر ۱۸۱۱ء میں ہوئی تھی۔ اس کے بعد حسین علی اور تراب علی آئے۔ مولوی اکرام علی ۱۸۱۶ء میں اس عہدے پر فائز ہوئے تھے۔

کالج لائبریری میں کتابوں کی چوری کا سلسلہ شروع ہوا تو لائبریری کو زبردست نقصان ہوا۔ ۱۸۰۷ء میں کتابیں گھر لیجانے پر پابندی لگادی گئی۔ ۱۸۳۵ء میں کالج لائبریری کا ایک بڑا حصہ ایشیاٹک سوسائٹی آف بنگال میں منتقل کر دیا گیا۔ اسی سال ایک کمیٹی تشکیل دی گئی جس کا کام اس عوامی لائبریری میں کتابوں کی فراہمی پر نظر رکھنا تھا۔

اس کمیٹی نے پبلک لائبریری کے ممبروں کو کالج لائبریری استعمال کرنے کی اجازت دینے کیلئے گورنمنٹ سے گذارش کی تھی۔ ان کی رپورٹ سے پتہ چلتا ہے کہ اس وقت تک کالج لائبریری میں ۹۱۲،ار کتابیں رہ گئی تھیں۔ پانچ سال کے عرصے میں پوری کالج لائبریری منتقل کر دی گئی۔ آج اس کی کتابیں ایشیاٹک سوسائٹی لائبریری، نیشنل لائبریری اور نیشنل آرکائیوز دہلی میں موجود ہیں۔ [1]

فورٹ ولیم کالج کی تالیفات

فورٹ ولیم کالج نے محدود طور پر مشرقی علوم کے مرکز کے طور پر کام کرنا شروع کیا تھا۔ پہلے بھی کہا جاچکا ہے کہ کالج کا اصل مقصد سول افسروں کی تربیت کرنا تھا۔ اس مقصد کو عملی جامہ پہنانے

کیلئے انہیں مغربی و مشرقی علوم و زبان سے واقف کرانے کے علاوہ عیسائیت کا سچا پیرو کار بنائے رکھنا بھی ضروری تھا۔ فورٹ ولیم کالج نے سیرام پور مشن پریس، ایشیاٹک سوسائٹی اور کلکتہ مدرسہ کو ایک لڑی میں پرونے کا بھی کام کیا۔ فورٹ ولیم کالج کا سب سے اہم کارنام مختلف ہندوستانی زبانوں میں نثر کو فروغ دینے کا ہے۔ گرچہ ولزلی نے اسے سول افسروں کی تربیت کے لئے قائم کیا تھا تاہم آپ ہی آپ یہ ایک لسانی ادارے کی حیثیت اختیار کرتا گیا۔ کالج میں ہندوستانی منشیوں کی تعداد خاطر خواہ تھی لیکن انہیں آزادانہ کام کرنے کی اجازت نہیں تھی۔ اردو کے اچھے اچھے انشاء پردازوں کو صرف ۲۰۰ یا ۱۰۰ اروپوں پر ٹرخایا جارہا تھا۔ اعلیٰ پایہ کے ادیبوں اور شاعروں کو ایسے انگریز نوجوانوں کو زبان سکھانے میں اپنا وقت ضائع کرنا پڑرہا تھا جنہیں مشرقی زبانوں سے کوئی شغف نہ تھا اور جو بڑی مجبوری کے عالم میں انہیں سیکھ رہے تھے۔ چونکہ ولزلی نے کمپنی کے عہدیداروں کے سامنے فورٹ ولیم کالج کے اخراجات اٹھانے کے لئے کتابوں کی تصنیف، تالیف، تراجم، طباعت و اشاعت کا ایک پروگرام پیش کیا تھا اور ان کی فروخت سے منافع کمانے کا تصور پیش کیا تھا اس لئے کالج کے تحت درس و تدریس کے علاوہ کتابوں کی طباعت اور اشاعت کا کام بھی شروع ہوا۔ اور درج ذیل موضوعات پر کتابیں لکھوائی گئیں۔

قواعد اور فرہنگ

گلکرسٹ کا عقیدہ تھا کہ کسی بھی زبان کے سیکھنے میں اس کا قواعد بہت اہم رول ادا کرتا ہے۔ اس مقصد کے تحت اس نے خود اردو زبان کا گرامر لکھا اور اپنے ساتھی انگریز پروفیسروں اور منشیوں کو دوسری مشرقی زبانوں کے گرامر لکھنے کا کام سونپا۔ مثلاً عربی زبان میں درج ذیل کام ہوئے۔

۱۔ جان بیلی (عربی پروفیسر) نے عربی صرف و نحو (۱۸۰۱ء) پر کتاب لکھی۔ اس نے کوئی نیا گرامر نہیں لکھا تھا بلکہ پرانے گرامر کو تین جلدوں میں شائع کیا تھا۔

۲۔ لمسڈن نے ۱۸۱۳ء میں عربی زبان کا گرامر لکھا۔

۳۔ لوکٹ نے ۱۸۱۴ء میں معیت العامل اور شرح معیت العامل کا ترجمہ پیش کیا۔

۴۔ شمس اللغات (۱۸۰۶ء) میں لکھی گئی جو فارسی اور عربی کے الفاظ کی فرہنگ تھی۔ اسے مولوی اللہ داد اور ان کے ساتھیوں نے ترتیب دیا تھا۔

۵۔ قاموس نامی عربی فرہنگ کی اشاعت بھی فورٹ ولیم کا ایک اہم کارنامہ ہے۔ یہ مجدالدین محمد ابن یعقوب کی لکھی ہوئی لغت تھی، جسے شیخ احمد نے ترتیب دیا تھا۔

فارسی عالموں میں عربی عالموں کی طرح قدیم عربی لغات ترتیب دینے کے بجائے جدید فارسی کی رہنمائی کا شوق تھا۔

۱۔ لمسڈن نے ۱۸۱۰ء میں فارسی زبان کا گرامر لکھا۔

۲۔ تھامس روبک نے ۱۸۱۸ء میں اپنے ساتھیوں کی مدد سے 'برہان قاطع' کا ترجمہ کیا۔ یہ محمد حسین ابن خلیفہ التبریزی کی تحریر تھی۔

سنسکرت میں درج ذیل کتابیں منظرِ عام پر آئیں۔

مگدبودھ (۱۸۰۷ء)، اشٹ ادھیائے (۱۸۰۹ء) سدھانت کاموّدی (۱۸۱۴ء) کی اشاعت ہوئی۔

کول برک اور کیری نے بھی سنسکرت کے گرامر لکھے جو ۱۸۰۵ء اور ۱۸۰۶ء میں شائع ہوئے۔

بعدازاں امرکوش، مدینی، ہراولی تصنیف ہوئیں۔

اردو قواعد، لغت، فرہنگ وغیرہ میں بھی اہم کام ہوا۔

گلکرسٹ نے دو جلدوں میں ہندوستانی۔ اردو لغت ۱۷۸۶ء اور ۱۷۹۰ء میں چھاپا۔ A grammar of The Hindoostanee Language ۱۷۹۶ء میں شائع ہوئی۔ یہی کتاب حذف و اضافہ کے بعد مبادیاتِ ہندوستانی کے نام سے ۱۸۰۲ء میں چھپی۔

ضمیمہ لغت و قواعد (رومن رسم الخط میں)۱۷۹۸ء، مشرقی زبان داں ۱۷۹۸ء، انٹی جارگونسٹ ۱۸۰۰ء میں شائع ہوئیں۔ ہندوستانی علم الہجا کا خاکہ ۱۸۰۲ء میں منظرِ عام پر آیا۔ The Stranger's East India Guide to Hindustanee اور ہندی/اردو لغت ۱۸۰۲ء میں شائع ہوئیں۔ ۱۸۰۸ء میں ہنٹر نے ایک لغت ترتیب دی، جسے جوزف ٹیلر نے اپنے ذاتی استعمال کیلئے ترتیب دیا تھا لیکن ہنٹر نے اس میں اضافہ کرکے شائع کردیا۔

مولوی امانت اللہ نے صرفِ اردو ۱۸۱۰ء میں لکھی۔ ۱۸۱۱ء میں تھامس روبک نے انگریزی۔ ہندی جہاز رانی لغت ترتیب دی، جس کا نام تھا English and Hindoostanee Naval

Dictionary of Tehcnical words and Phrases

۱۸۱۱ء میں General Principles of Inflection and Conjugation in Braj Bhasha چھپی جو دستیاب نہیں ہے۔ ۱۸۱۴ء میں ولیم پرائس نے للوجی لال کی کتاب 'پریم ساگر' کی فرہنگ تیار کی۔ ولیم کیری نے بنگلہ، مراٹھی، تیلگو، کنڑ اور پنجابی گرامر لکھے۔ اس نے بنگلہ (۱۸۰۵) اور مراٹھی (۱۸۰۵ء) لغات بھی ترتیب دیئے۔ موہن پرساد ٹھاکر نے اڑیہ لغت ترتیب دینے کا کام کیا۔

نصابی کتابیں

فورٹ ولیم کالج نے نظم سے زیادہ نثر پر توجہ کی۔ دراصل انگریزوں کو ہندوستانی زبانوں میں نثر کی کمی کا شدت سے احساس تھا۔ 'انالس آف دی کالج آف فورٹ ولیم' میں میر شیر علی افسوس کی 'آرائشِ محفل' کا تعارف کراتے ہوئے یہ جملے کہے گئے ہیں، جن سے اس بات کا پتہ چلتا ہے کہ وہ نثر کی شدید ضرورت محسوس کر رہے تھے۔

> "The dissemination by means of the press, of works composed by Natives eminent for their knowledge and practical skill in this dialect, must gradually polish, and fix a standard of exellence in a language, which though long employed as an elegant medium of colloquial intercourse, and as the vehicle of poetical imagery, has hitherto been little used for prose composition. (1)

اس لئے نصابی کتابوں کی تیاری میں انہوں نے شاعری سے گریز کیا۔ حالانکہ فارسی گلستاں، بوستاں، دیوانِ سعدی، سکندر نامہ اور سنسکرت رامائن، مہابھارت، بھگوت گیتا، گیتا گووند، میگھ دوت، نلادی، میگھ کاویہ وغیرہ کے تراجم چھاپے گئے نیز اردو میں بھی باغ اردو (ترجمہ گلستاں از میر شیر علی افسوس) کی اشاعت ہوئی، کاظم علی جوان کا بارہ ماسہ منظر عام پر آیا، میر سوز کے کلام کو محمد اسلم نے ترتیب دیا اور کالج نے چھاپا، للوجی لال نے راج نیتی کے نام سے ہتوپدیش کا ترجمہ کیا وغیرہ وغیرہ لیکن انگریزوں کی زیادہ توجہ عربی، فارسی، اور سنسکرت قصوں کو اردو میں ڈھالنے میں صرف ہوئی۔

۱۔ Aannals of The College of Fort William, By Thomas Roebuck.

تاریخ

فورٹ ولیم کالج کے عہدیداروں کا خیال تھا کہ ہندوستانیوں کے دل و دماغ سے واقف ہونے کے لئے ان کے ملک کی تاریخ کو بھی جاننا ضروری ہے۔ اس مقصد کے تحت انہوں نے تاریخ لکھوائی۔

مرتونجوئے بدیالنکار نے بنگلہ میں تاریخ لکھی۔

رام رام باسو نے راجہ پرتاپدتیہ چرتر نامی کتاب لکھی (۱۸۰۱ء) جو بنگال کے سولہویں صدی کے ایک زمیندار کی سوانح ہے۔

راجیب لوچن مکھرجی نے بنگلہ میں ہی کرشنا نگر کے راجہ کرشن چندر کی زندگی کا حال لکھا (۱۸۰۵ء)۔ ۱

افسوس نے 'آرائشِ محفل' لکھی جو ہندو راجاؤں کی کہانی ہے۔ عربی اور فارسی تواریخ کے تراجم چھاپے گئے۔

اس کے علاوہ علمِ نجوم (مجموعۂ شمسی)، ریاضیات (خلاصۃ الحساب)، منطق (قطبی)، اسلامی فقہ و ہندو دھرم شاستر، معدنیات، وغیرہ کی کتابیں بھی لکھوائی گئیں۔

جو اہلِ علم و ادب کالج کے ملازم نہیں تھے، ان لوگوں سے بھی کالج نے کتابیں لکھوائیں اور ان میں سے کچھ ایسے بھی ہیں جن کی کالج نے کتاب کی اشاعت کے سلسلے میں مالی معاونت کی۔ مثلاً بنگلہ کے گولک ناتھ۔

غرض فورٹ ولیم کالج کے زیرِ اہتمام بقول لکشمی ساگر وارشنے ۱۹ راگست ۱۸۰۳ء تک ۴۵ سے زیادہ کتابیں تصنیف ہو چکی تھیں۔ ۲

گرچہ فورٹ ولیم کالج کے زیرِ اہتمام لکھی اور چھاپی جانے والی کتابوں میں سے اکثر اب نایاب ہو چکی ہیں تاہم جو امتدادِ زمانہ سے محفوظ رہ گئی ہیں ان کی مزید حفاظت ضروری ہے۔ یوں تو فورٹ ولیم کالج کی ادبی خدمات سے انحراف ممکن نہیں لیکن اکثر اس کے پس پردہ انگریزوں کی مفاد پرستی کو زیادہ اہمیت دیتے ہوئے فورٹ ولیم کالج کی کاوشوں کو کمتر ثابت کرنے کی کوشش کی گئی

۱۔ فورٹ ولیم کالیر پنڈت۔ (بنگلہ) ازشری برجیندر ناتھ بندھوپادھیائے۔ بنگیہ ساہتیہ پریشد۔ کلکتہ۔ بیساکھ ۱۳۴۹۔

۲۔ فورٹ ولیم کالج۔ لکشمی ساگر وارشنے۔ الہ آباد یونیورسٹی ہسٹری، ۲۰۰۲ء، ص ۱۸۳-۱۸۴

ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ اگر فورٹ ولیم کالج کا قیام عمل میں نہ آیا ہوتا تو شائد اردو کے علاوہ دوسری جدید ہند آریائی زبانوں میں نثر اتنی سرعت سے آگے نہ بڑھتی۔ چھاپہ خانے کی سہولتوں نے طباعت کے کام کو آگے بڑھایا اور تعلیم وتربیت، ڈسپلن، مشرقی ومغربی علوم کی اہمیت، وغیرہ سے متعلق ہمارا ذہن صاف ہوا۔ اردو نثر بوجھل اور مغلق فضا سے نکل کر سلاست کی مثال پیش کرنے لگی اور بہت مختصر سے عرصے میں نثر پر ہمارا اعتماد بحال ہوگیا۔

فورٹ ولیم کالج اور گلکرسٹ

فورٹ ولیم کالج گرچہ ولزلی کے منصوبے کی پیداوار تھا تاہم اس کو ہندوستان کی ملکی زبانوں کا مرکز بنانے کے پیچھے گلکرسٹ کا ذہن کام کر رہا تھا۔

جان بارتھوک گلکرسٹ (John Borthwick Gilchrist) کی پیدائش ایڈنبرا میں ۱۷۵۹ء میں ہوئی تھی۔ اسکی تعلیم جارج ہریٹ ہاسپٹل (George Heriot's Hospital) میں ہوئی۔ میڈیکل کی تعلیم مکمل ہونے کے بعد وہ ایسٹ انڈیا کمپنی میں اسسٹنٹ سرجن مقرر ہوا اور ۳/اپریل ۱۷۸۳ء کو کلکتہ پہنچا۔ عتیق صدیقی کے مطابق گلکرسٹ ۱۷۸۲ء میں بمبئی پہنچا تھا۔ (گلکرسٹ اور اسکا عہد، صفحہ:۳۸) تاہم 'The Dictionary of National Biography' میں ایسی اطلاع نہیں ملتی۔ بہرحال، ایسٹ انڈیا کمپنی ان دنوں ایسے ملازموں کو سرآنکھوں پر بٹھاتی تھی جو مشرقی زبانوں بالخصوص فارسی سے واقف ہوتے تھے۔ تاہم گلکرسٹ نے بہت جلد یہ محسوس کرلیا تھا کہ ہندوستانیوں سے ربط ضبط بڑھانے کے لئے یہاں کی مقامی زبان کا جاننا زیادہ ضروری ہے بلکہ وہ یہاں کی مقبول ترین زبان یعنی اردو (جسے وہ ہندوستانی کہتا ہے اور دوسرے Moors) میں فارسی کا قایم مقام بننے کے جوہر دیکھ رہا تھا۔ دی ڈکشنری آف نیشنل بایوگرافی میں لکھا ہے کہ :

> .... but Gilchrist saw that to hold effective intercourse with the Natives, Hindustani should be substituted. (1)

اس نے ہندوستان کی مقبول ترین زبان اردو سیکھنے کی سوچی۔ اس مقصد کے لئے اس نے کتابی علم حاصل کرنے کیساتھ ساتھ عام لوگوں سے ملنا جلنا بھی شروع کیا۔ ہندوستانیوں میں پوری

۱- The Dictionary of National Biography, vol-vii, ed. by Sir Leslie Stephen & Sir Sidney Lee, Oxford University Press., 1950., p 1221

طرح گھلنے ملنے کے لئے اس نے ہندوستانیوں کا لباس پہننا شروع کیا اور ان کی تہذیب اور طرز معاشرت سے قریب ہوتا گیا۔ نیشنل بایوگرافی میں لکھا ہے :

> Clad in native garb he travelled through those provinces where Hindustani was spoken in its greatest purity, and also acquired a good knowledge of Sanskrit, Persian and other Eastern tongues. (1)

ہندوستانی سے اسکی بے پناہ رغبت کو دیکھتے ہوئے ایسٹ انڈیا کمپنی، اسکے عہدیداروں اور ملازموں میں بھی اس زبان کی اہمیت کا احساس جاگا۔ پہلے گلکرسٹ کے مدرسہ اورینٹل سیمنری اور اس کے بعد فورٹ ولیم کالج میں مشرقی زبانوں بالخصوص اردو (ہندوستانی) کی تعلیم کا انتظام ہوا۔ گلکرسٹ نے ارباب اقتدار کو اپنا ہم نوا بنانے کے لئے ان کے سامنے یہ تجویز پیش کی کہ ہندوستان میں انگریزی حکومت کے استحکام کیلئے ضروری ہے کہ انگلستان سے آنے والے سول (civil) افسران کو یہاں کی مقامی زبانوں کی تعلیم دی جائے۔

مدرسۂ ہندی یا اورینٹل سیمنری کی تجویز گلکرسٹ نے گورنر جنرل لارڈ ولزلی کے سامنے پیش کی۔ ساتھ ہی اس نے کمپنی کو اپنی خدمات کا یقین دلایا۔ ۲۱/دسمبر ۱۷۹۸ء کو گورنر جنرل کی کونسل نے یہ تجویز منظور کرلی اور طے پایا کہ یکم جنوری ۱۸۰۱ء سے صرف انہی لوگوں کو اعلیٰ عہدوں پر سرفراز کیا جائے گا جو ہندوستان کی ایک یا ایک سے زیادہ زبانوں سے واقفیت رکھتے ہوں گے۔ یکم جنوری ۱۷۹۹ء میں گلکرسٹ کی یہ تجویز عملی صورت اختیار کرگئی۔ ۲۴/دسمبر ۱۷۹۸ء کو سرکاری سکریٹری جی۔ ایل بارلو نے گلکرسٹ کے نام تقرری کا پروانہ بھیجا۔ ۲۵/دسمبر ۱۷۹۸ء سے وہ باقاعدہ طور پر تدریسی فرائض انجام دینے لگا۔ (گلکرسٹ اور اس کا عہد، صفحہ ۸) لیکن ولزلی کے ذہن میں ایک شاندار کالج کا خاکہ پنپ رہا تھا۔ لہٰذا اس نے ۱۰/جولائی ۱۸۰۰ء میں فورٹ ولیم کالج کے قیام کا اعلان کردیا جس پر گذشتہ صفحات میں تفصیلی بحث کی جاچکی ہے۔

ہندوستانی زبانوں سے واقفیت کی بنیاد پر گلکرسٹ یوں بھی اورینٹل سیمنری کی تدریسی ذمہ

۱- The Dictionary of National Biography, vol-vii, ed. by Sir Leslie Stephen & Sir Sidney Lee, Oxford University Press., 1950., p 1221

داریاں اٹھا رہا تھا۔ جب فورٹ ولیم کالج قائم ہوا تو شعبۂ ہندوستانی کا صدر اسے ہی مقرر کیا گیا۔ اس نے ہندوستانی زبان میں نثری تصانیف کی کمی کو دیکھتے ہوئے فارسی، عربی، سنسکرت وغیرہ سے اردو میں کتابیں ترجمہ کروائیں۔ ساتھ ہی ساتھ اس نے فارسی رسم الخط کے علاوہ دیوناگری میں بھی کتابوں کی اشاعت کا کام شروع کیا۔ اس کا مقصد ایک ایسی زبان کو فروغ دینا تھا جو نہ فارسی و عربی کے ادق الفاظ سے بوجھل معلوم پڑتی ہو اور نہ سنسکرت کے بھاری بھرکم لفظوں سے گرانبار ہو۔ غرض اس کے مدِ نظر ایک ایسی زبان کا خاکہ تھا جو صاف اور رواں ہو نیز بول چال کی زبان سے قریب ہو تاکہ نو واردانگریز افسران کو منشیوں سے بات چیت کرنے میں دقت نہ پیش آئے۔ اس نے قواعد اور لغات کی ترتیب و تدوین کا بھی کام کیا۔ دراصل گلکرسٹ نے قواعد اور لغات کی ضرورت کو مدرسہ ہندی اور فورٹ ولیم کالج کے قیام سے بھی بہت پہلے محسوس کر لیا تھا، اس لئے اس نے پہلے اپنے پیش رووں کے قواعد سے بھرپور استفادہ کیا۔ اس کے بعد خود ہندوستانی کی لغت تیار کرنے میں مشغول ہو گیا۔ اس نے فتح گڈھ، فیض آباد، بنارس وغیرہ کے سفر کے دوران بھی اس زبان کے مختلف پہلوؤں سے کافی واقفیت حاصل کر لی تھی۔ گلکرسٹ کی لغت کی پہلی جلد ۱۷۸۶ء میں منظرِ عام پر آئی اور دوسری جلد ۱۷۹۰ء میں۔ اس میں الفاظ کے معنی رومن اور فارسی دونوں خطوں میں دیئے گئے تھے۔ اسکے علاوہ اس نے درج ذیل کتابوں کی تصنیف و تالیف کا کام انجام دیا :

۱۔ ہندوستانی زبان کی قواعد A Grammer of The Hindoostani Language. (1796).

گلکرسٹ کی یہ کتاب بعد میں رسالۂ گلکرسٹ کے نام سے مشہور ہوئی۔ میر بہادر علی حسینی نے اسکی تلخیص پیش کی تھی جو ۱۸۲۰ء میں شائع ہوئی۔ ڈاکٹر سمیع اللہ اسکی تاریخ اشاعت ۱۸۰۲ء بتاتے ہیں۔ (فورٹ ولیم کالج - ایک مطالعہ، صفحہ: ۱۰۷)

۲۔ ضمیمہ لغت و قواعد۔ یہ رومن خط میں ہے۔ Appendix (1798)

۳۔ مشرقی زبان داں۔ The Oriental Linguist. (1798)

اس میں ہندوستانی کی نوعیت سے بحث ہے۔

۴۔ انٹی جارگونسٹ۔ The Anti Jargonist (1800).

اس کتاب میں ہندوستانی کا مختصر تعارف پیش کیا گیا ہے۔ اسکے علاوہ الفاظ کی فرہنگ بھی ہے۔ 'دی ڈکشنری آف نیشنل بایوگرافی' میں اسکے ایک حصے کو مشرقی زبان داں کی تلخیص بتایا گیا ہے۔

۵۔ نوایجاد یعنی نقشۂ افعالِ فارسی مع مصدراتِ آں و مترادفاتِ ہندوستانی و فارسی و انگریزی۔ A New Theory and Prospectus of Persian Verbs. (1801).

نام سے ہی ظاہر ہے کہ اس میں فارسی زبان کے افعال و مصادر کے علاوہ ہندوستانی، فارسی و انگریزی کے مترادفات دیئے گئے ہیں۔

۶۔ ہندی مشقیں۔ کالج کے امتحان کے لئے فارسی خط میں تیار کی گئی۔ Hindi Exercises (1801)

۷۔ The Stranger's East India Guide to The Hindoostanee (1802)

یہ نو واردوں کے لئے تیار کی گئی تھی تاکہ انہیں ہندوستانی کی ابتداء اور اس کے مختلف ناموں سے آگاہی ہو سکے۔

۸۔ Hindoostanee Dictionary or Student's Introductor to the Hindoostanee Language. (1802)

اس میں ہندوستانی زبان کے قواعد پر گلکرسٹ کا مضمون اور ہندوستانی (اردو) کے رسم خط کی اصلاح کا نظریہ پیش کیا گیا ہے۔

۹۔ مبادیاتِ ہندوستانی۔ The Hindoostanee Principles. (1802)

یہ 'ہندوستانی زبان کی قواعد' کی بدلی ہوئی شکل ہے جو نظرِ ثانی کے بعد چھاپی گئی تھی۔

۱۰۔ ہندوستانی علم الہجا کا خاکہ۔ Practical Outline or a sketch of Hindoostanee (1802)

۱۱۔ ہندوستانی زبان میں مستعمل عربی الفاظ The Hindee Arabic Mirror. (1802).

۱۲۔ بیاضِ ہندی۔ (دو جلدوں میں) The Hindee Manual or Casket of

India. (1802)

اس میں باغ و بہار، شکنتلا، مادھونل و کام کندلا، سنگھاسن بتیسی، بیتال پچیسی، توتا کہانی، نثر بے نظیر، اخلاقِ ہندی وغیرہ کے اقتباسات شائع کئے گئے ہیں۔ اس کے علاوہ مرثیہ مسکین کے بند بھی ہیں۔

۱۳۔ اتالیق ہندی۔ The Hindi Moral Preceptor.(1803)

یہ سعدی کی ''پند نامہ'' کا ترجمہ ہے۔ اردو ترجمہ ولا نے کیا تھا۔ انگریزی میں منظوم ترجمہ گلکرسٹ نے اور انگریزی نثر میں گلیڈون نے کیا تھا۔

اس کے علاوہ اس نے انگریزی اردو مکالموں کی کتاب بھی ترتیب دی تھی، نیز کئی کتابوں کی ترتیب و تصحیح میں بھی شامل تھا۔

گلکرسٹ کی خدمات کا اعتراف کونسل کی روداد مورخہ ۱۷/اگست ۱۸۰۰ء میں اس طور پر نظر آتا ہے :

Para : 21 & 22

"We can not conclude this report without expressing our sense of the merits of Mr. Gilchrist. That gentleman has been assiduously employed, for several years, in forming a grammar and Dictionary of the Hindoostanee Language, the universal colloquial language throughout India, and of the most general utility. From the want of a grammar of this language, and the difficulty of its construction, it has hitherto been spoken very imperfectly by Europeans. The literary labours and talents of Mr. Gilchrist have furnished the means of acquiring a knowledge of this language with facility and correctness. With regard to the conduct of Mr. Gilchrist since he was appointed by Your Lordship to instruct the Junior Civil servants

of the company in the Hindoostanee language, his proceedings and information before Your Lordship evince that for the last eighteenth months (with the exception of a vacation of a fortnight during the Christmas holidays) he has been employed with the most unremitting assiduity in the prosecution of the duty which your Lordship assigned to him. (1)

دی ڈکشنری آف نیشنل بایوگرافی کے مطابق گلکرسٹ خرابیِ صحت کی وجہ سے انگلینڈ لوٹ جاتا ہے۔

In 1804 ill health compelled him to return home. On his departure he received from the Governor General in Council a letter to the court of Directors in London, commending him to their favour as one who had done much to promote the study of Oriental Languages. (2)

یہی نہیں، لارڈ ولزلی مسٹر ایڈمنگٹن (لارڈ سڈ منتھ) کے نام بھی ایک تعارفی خط دیتا ہے جس میں گلکرسٹ کی علمی و ادبی خدمات کا اعتراف کیا گیا تھا۔ وہاں پہنچ کر گلکرسٹ پہلے ایڈنبرا میں مقیم ہوتا ہے۔ ۳۰/اکتوبر ۱۸۰۴ء میں یہاں کی یونیورسٹی نے ایل ایل ڈی کی ڈگری عطا کی تھی۔ اس کے بعد وہ نکلسن اسکوائر منتقل ہو جاتا ہے۔ یہاں گھر کے ایک حصے میں وہ ہندوستانی چڑیاں پالنے لگا تھا۔

۶/جنوری ۱۸۰۹ء کو ایسٹ انڈیا کمپنی سے ریٹائر ہونے کے بعد اسے ۳۰۰ پاؤنڈ سالانہ بطور پنشن ملنے لگے تھے۔ اس نے لکھنے پڑھنے کا سلسلہ جاری رکھا اور سیاست میں بھی دلچسپی دکھانی شروع کی۔ اس کی تقریریں اکثر جارحانہ ہوتی تھیں۔ اس کی شعلہ بیانی کی وجہ سے تکرار کی نوبت آجاتی تھی۔

۱۔ Annals of The College of Fort William., p. 7

۲۔ The Dictionary of National Biography. vol-vii., p 1222

His fiery temparament, violent politics, which savoured strongly of republicanism, and no less violent language, appear to have considerably astonished his fellow citizens, especially at civic meetings. (1)

گلکرسٹ نے اپنے دوست جیمس انگلس (James Inglis) کے ساتھ ملکر ایک بینک بھی کھولا تھا، جس میں اسے ناکامی ہوئی۔

۱۸۱۶ء میں وہ لندن آ گیا۔ یہاں سکونت اختیار کرنے کے بعد وہ کمپنی کے ملازمین کو نجی طور پر ہندوستانی زبان سکھانے لگا۔ اس کے بعد ۱۸۱۸ء میں لیسٹر اسکوائر کے 'اورینٹل انسٹی ٹیوٹ' میں پروفیسر ہوگیا۔

زندگی کے آخری دنوں میں وہ اسکاٹ لینڈ گیا اور پھر پیرس۔ ۹ رجنوری ۱۸۴۱ء میں پیرس میں ہی اس کا انتقال ہوا۔ اردو ادب کے سبھی تاریخ دانوں نے گلکرسٹ کا نام محبت اور احترام سے لیا ہے۔ مولوی محمد یحییٰ تنہا کا کہنا ہے کہ :

> "نظمِ اردو پر جو احسان ولی نے کیا، اس سے بھی زیادہ نثر اردو پر جان گلکرائسٹ نے کیا ہے۔" [۲]

گلکرسٹ کے علاوہ دوسرے انگریز عالموں نے بھی اردو، فارسی، بنگلہ، وغیرہ میں تصنیف و تالیف کا سلسلہ برقرار رکھا۔ تھامس روبک، فرانسس گلیڈون، ولیم ٹیلر، ولیم پرائس، ولیم کیری وغیرہ نے ہندوستانی زبانوں کے ارتقا کیلئے (خواہ کسی مخصوص مفاد کے تحت ہی) جو کارنامے انجام دئے ہیں وہ ناقابلِ فراموش ہیں۔

فورٹ ولیم کالج کے اہم منشی

گلکرسٹ نے ولزلی کی ایماء پر ہندوستان بھر سے اچھے اچھے انشاء پردازوں کو بلایا اور کلکتہ کے فورٹ ولیم کالج میں جمع کر لیا تا کہ اردو نثر میں کتابیں لکھوائی جائیں اور صاحب عالیشان ہندوستان کی مقبول ترین زبان سیکھ کر ہندوستان پر بخوبی راج کر سکیں۔ جن منشیوں نے اپنی

۱- The Dictionary of National Biography. vol-vii., p 1222

۲- سیر المصنفین (جلد اول)۔ محمد یحییٰ تنہا۔ محبوب المطابع دہلی۔ ۱۹۲۴، صفحہ ۵۲

فصاحت کا لوہا منوایا وہ درج ذیل ہیں۔

میر بہادر علی حسینی

میر بہادر علی حسینی فورٹ ولیم کالج کے شعبۂ ہندوستانی کے ہیڈ منشی تھے۔ آپ کا انتخاب ۴ رمئی ۱۸۰۰ء کو ہوا تھا (وارشنے صفحہ ۲۲)۔ حسینی نے اپنی زندگی کے حالات کہیں درج نہیں کئے ہیں، اس لئے ان کے خاندانی کوائف سے واقفیت نہیں ہو پاتی۔ بقول وارشنے کالج کونسل نے ۱۷ راکتوبر ۱۸۰۴ء کو انہیں ہیڈ منشی کے عہدے سے ہٹا کر مترجم کر دیا تھا۔ ان کی جگہ لکھنو سے تشریف لانے والے شاعر میر شیر علی افسوس کو ہیڈ منشی بنا دیا گیا تھا۔ جاوید نہال ۱۸۰۸ء تک انہیں ہیڈ منشی بتاتے ہیں۔ لکھتے ہیں :

> "وہ ۱۸۰۸ء کے دسمبر میں میر منشی کے عہدے سے سبکدوش ہو چکے تھے اور میر شیر علی افسوس ان کے جانشیں مقرر ہوئے تھے۔" [۱]

آپ نے اپنی زندگی کے آخری سال کہاں گذارے، اس کے متعلق بھی کچھ پتہ نہیں چلتا۔ حسینی نے درج ذیل کتابیں تصنیف کیں :

۱- **نثرِ بے نظیر** : میر حسن کی مثنوی سحر البیان کا نثری خلاصہ ہے جو ۱۸۰۲ء میں مکمل ہوا۔ اور ۱۸۰۳ء میں ہندوستانی پریس، کلکتہ سے شائع ہوا۔ حسینی کی یہ کتاب بے حد مقبول ہوئی تھی۔ اس کے متعدد ایڈیشن چھپے۔ دیباچے میں لکھی ہوئیں عبارتیں اس بات کی گواہ ہیں کہ پہلے اسے بول چال کی زبان سے قریب کر کے لکھا اور پھر نظرِ ثانی کے بعد زبان دانوں کے لئے مع اضافہ تحریر کیا۔ لکھتے ہیں :

> "حکم سے خداوندِ نعمت، روشن ضمیر، عالی حوصلہ، والہ تدبیر، جان گلکرسٹ صاحب بہادر دام حشمت کے عاصی میر بہادر علی حسینی نے شروع قصے سے محاورۂ خاص کے نثر میں لکھا۔ پہلے اس سے یہ خاکسار اس کہانی کو خاص و عام کی بول چال کے مطابق بہ طرزِ سہل واسطے صاحبانِ نوآموز کے تحریر کر چکا تھا۔ اب جی میں یوں آئی ہے کہ اس داستانِ شیریں کو (کہ فی الحقیقت شیریں تر ہے) اس رویے سے نثر کروں کہ ہر ایک زبان داں و شاعر اس کو سن کر عش عش کرے اور

۱- جاوید نہال۔ انیسویں صدی میں بنگال کا اردو ادب۔ اردو رائٹرز گلڈ۔ کلکتہ-۱۲۔ سال اشاعت ندارد، صفحہ ۸۸

اس ہیچمداں کی ایک یادگاری دنیا میں رہے۔'' [1]

۲- اخلاق ہندی : فارسی مفرح القلوب کا ترجمہ ہے۔ اسے تاج الدین نے سنسکرت 'ہتوپدیش' سے فارسی میں منتقل کیا تھا اور حسینی نے گلکرسٹ کی فرمائش پر ۱۸۰۲ء میں فارسی سے اردو کیا۔ اس کتاب میں کئی نصیحتیں پیش کی گئی ہیں۔ حسینی کا کہنا ہے کہ :

''اس کتاب کو ہند میں ہتوپدیش' یعنی نصیحتِ مفید کہتے ہیں اور اس میں چار باب مندرج ہیں۔ ایک میں ذکر دوستی کا، دوسرے میں دوستوں کی جدائی کا، تیسرے میں لڑائی کی ایسی باتوں کا کہ اپنی فتح ہو اور مخالف کی شکست، چوتھے میں کیفیت ملاپ کی، خواہ لڑائی کے آگے ہو یا پیچھے۔'' [2]

۳- تاریخ آشام : یہ شہاب الدین محمد طالش کی فارسی تصنیف کا اردو ترجمہ ہے جو ۱۸۰۵ء میں مکمل ہوا۔ طالش، اورنگ زیب بادشاہ کی سلطنت میں نواب عمدۃ الملک میر محمد سعید آردستانی کا رفیق تھا۔ اس تاریخ میں آسام پر میر جملہ (سپہ سالار اورنگ زیب) کے حملے (۱۶۶۲ء) کی داستان ہے نیز آسام کے محل وقوع اور موسموں، پھولوں، پھلوں، چرندوں پرندوں، آداب زندگی، رسوم و رواج پر روشنی ڈالی گئی ہے۔ اس کا قلمی نسخہ ایشیاٹک سوسائٹی آف بنگال کی لائبریری میں محفوظ ہے۔ سوسائٹی کلیکشن نمبر ۲۷ ہے۔ حسینی نے یہ ترجمہ ہربرٹ ہارنگٹن اور ہنری کول بروک کی فرمائش پر کیا تھا۔

۴- قواعد زبان اردو مشہور بہ رسالۂ گلکرسٹ : گلکرسٹ کی قواعد کا خلاصہ ہے۔ یہ کتاب گلکرسٹ کی سلسلۂ لسانیات ہندوستانی کی جلد اور کا تیسرا حصہ ہے۔ یہ حصہ پہلی بار ۱۷۹۶ء میں کرانیکل پریس کلکتہ سے شائع ہوا تھا۔

بقول خلیل الرحمٰن داؤدی :

''گلکرسٹ کی کتاب ہندوستانی زبان کے قواعد مطبوعہ ۱۷۹۶ء میں اردو ہندی طباعت کا اولین نمونہ ملتا ہے۔'' [3]

گلکرسٹ نے اردو کے نامور شعراء مثلاً الی، حاتم، یقین، سودا، درد، آبرو، میر حسن، قائم، سوز، مسکین وغیرہ کے اشعار کا انتخاب شائع کیا ہے۔ مسکین کا تو پورا مرثیہ درج کر دیا ہے۔ شیکسپیئر کے دو ڈراموں کے ایک ایک حصے کا ترجمہ اردو زبان میں ملتا ہے۔ آخر میں گلکرسٹ نے اردو کے

۱- نثر بے نظیر۔ جبل المتین پریس، کلکتہ، ۱۹۰۲ء، صفحہ ۱

۲- قلمی نسخہ، اخلاق ہندی، ایشیاٹک سوسائٹی آف بنگال

۳- رسالہ گلکرسٹ، مرتبہ خلیل الرحمٰن داؤدی، مجلس ترقی ادب، لاہور، صفحہ ۸

۳۱ صاحب دیوان شعراء کے نام کی فہرست دی ہے۔ چونکہ کتاب بہت ضخیم تھی اس لئے حسینی نے تلخیص لکھی۔ اس کے سنہ اشاعت کے بارے میں اختلاف ہے۔ مولوی سید محمد، رام بابو سکسینہ، مرزا محمد عسکری، حامد حسن قادری، محمد یحییٰ تنہا ۱۸۱۶ء بتاتے ہیں۔ ڈاکٹر سمیع اللہ ۱۸۰۳ء (فورٹ ولیم کالج ایک مطالعہ، صفحہ: ۱۱۹) لکھتے ہیں۔ اور گریرسن 'لنگوسٹک سروے آف انڈیا' جلد نہم میں ۱۸۱۰ء بتاتا ہے۔ جاوید نہال نے میر بہادر علی حسینی کی حیات و خدمات پر نظر ڈالتے ہوئے (انیسویں صدی میں بنگال کا اردو ادب، صفحہ ۸۵ تا ۹۸) اس کا ذکر ہی نہیں کیا ہے۔ لکھتے ہیں :

''میر منشی بہادر علی حسینی کی یہی تین کتابیں مشہور ہیں۔ اخلاق ہندی اور نثر بے نظیر تو چھپ چکی ہیں۔ مگر تاریخ آشام کو چھپنا نصیب نہیں ہوا۔''

(انیسویں صدی میں بنگال کا اردو ادب، جاوید نہال، صفحہ: ۹۸)

حسینی نے درج بالا کتابیں تصنیف کرنے کے علاوہ کئی دوسری کتابوں کے ترجمے میں بھی ہاتھ بٹایا تھا۔

میر شیر علی افسوس

میر شیر علی نام، تخلص افسوس۔ 'دیوانِ جہاں' میں بنی نرائن جہاں لکھتے ہیں کہ :

''افسوس تخلص۔ نام میر شیر علی۔ میر علی مظفر خاں کے بیٹے۔ پہلے تھوڑے دنوں میر سوز سے اصلاح لی۔ بعد اسکے شاگرد ہوئے میر حیدر علی حیراں کے۔ نارنول کے رہنے والے کلکتے میں رحلت کی۔'' [1]

افسوس نے اپنا حال 'باغِ اردو' کے دیباچے میں بیان کیا ہے۔ جس سے پتہ چلتا ہے کہ افسوس کے مورث اعلیٰ سید جمال الدین حاجی خافی کے ساتھ خاف سے ہندوستان وارد ہوئے اور قصبہ نارنول میں اقامت پذیر ہوئے۔ افسوس کے دادا سید غلام مصطفےٰ اپنے دو بیٹوں سید غلام علی خاں اور سید مظفر خاں کے ہمراہ محمد شاہ بادشاہ کے ابتدائی دور حکومت میں (۱۷۲۷ء) میں دہلی چلے آئے اور عمدۃ الملک امیر خاں کے امراء میں شامل ہوگئے۔ افسوس کی پیدائش دہلی میں ۱۱۶۰ھ مطابق ۱۷۴۷ء ہوئی۔ جب افسوس گیارہ سال کے تھے تو ان کے والد مظفر خاں اودھ چلے گئے اور شجاع الدولہ کی سرکار میں تین سو روپے ماہانہ پر ملازم ہوگئے۔ بعد ازاں میر محمد جعفر خاں، صوبہ دار بنگالہ

۱- قلمی نسخہ دیوان جہاں، ایشیاٹک سوسائٹی آف بنگال

کے بلانے پر مرشدآباد آگئے اور توپ خانہ کے داروغہ مقرر ہوئے۔ زندگی کا آخری حصہ اودھ اور حیدرآباد میں گذارا۔ حیدرآباد میں ہی آپکا انتقال ہوا۔ مرزا علی متخلص بہ لطف اپنے تذکرہ 'گلشنِ ہند' (۱۸۰۱ء) میں افسوس کا حال بالتفصیل بیان کرتے ہیں۔ لکھتے ہیں :

''افسوس تخلص۔ میر شیر علی نام۔ والد ماجد ان کے سید مظفر علی خاں، داروغۂ توپ خانۂ نواب قاسم خاں عالی جاہ کے تھے۔ سلسلہ سیادت کا ان کی حضرتِ اسمٰعیل اعرج کو کہ بڑے بیٹے حضرت جعفر صادق علیہ السلام کے تھے، پہنچتا ہے۔ وطن بزرگوں کا خاف، ایک مکان ہے، علاقہ میں عرب کے۔ بزرگوں نے ان کے ہندوستان میں آ کے نارنول میں سکونت اختیار کی۔''[1]

افسوس لکھنؤ میں اقامت پذیر تھے۔ آپ نے اپنے فضل وکمال کی بنا پر بہت نام پیدا کیا اور اردو کے اچھے شاعروں میں شمار ہونے لگے۔ انکی خود اعتمادی کافی بڑھ گئی تھی جسے دیکھ کر بزرگ جز بز ہورہے تھے۔ تذکرہ خوش معرکۂ زیبا کا مؤلف سعادت خاں ناصر، افسوس کے ضمن میں کہتا ہے :

''افسوس۔ خال وخطِ خوباں سے مانوس۔ میر شیر علی خاں، تخلص افسوس ابن مظفر علی خاں داروغۂ توپ خانہ عالی جاہ۔ پہلے میر سوز کا شاگرد تھا بعد (میر) علی حیراں سے مستفید ہوا۔ ایک دن جرأت کے اس مطلع پر سرِ مشاعرہ معترض ہوا۔

گلبازی کے رتبہ کو ولا کاش تو پاتا ۔۔۔ ہاتھوں سے جو گرتا تو وہ آنکھوں سے اٹھاتا

یعنی یہ مطلع بے اضافتِ گل بے معنی ہے۔ جرات نے شکایت اس کی مرزا رفیع سودا سے کی۔

(مرزا نے) کہا۔ گلبازی اور گل بازی دونوں درست ہیں بلکہ گلبازی بیشتر استعمال میں ہے۔ چونکہ روزوں شعار اس کا خود پسندی ہوا ہے، یہ تضمین اس کی تنبیہ کو کافی ہے :

افسوس کہ تجھ کو سوز و حیراں ۔۔۔ سمجھا کے بہت ندان ہارے
درماں و درمیاں نہ سمجھا ۔۔۔ اب تک تو، اور اس پہ پیارے
جرات کے سخن پر خوردہ گیری ۔۔۔ محفل میں کرے ہے واہ وا رے
اب چاہئے یوں کہ ترے حق میں ۔۔۔ ہر ایک یہ گلی گلی پکارے

۱- گلشن ہند۔ مرزا علی لطف۔ دارالاشاعت، پنجاب۔ ۱۹۰۶، صفحہ ۵۶

کانے نہ نہارے ٹیٹ اپنا ۔۔۔ اور غیر کی پھلی کو نہارے[1]

بقول لطف، مسٹر بارلو نے افسوس کی زبان دانی کے چرچے سن کر انہیں کلکتے بلوایا، دوسو روپے مشاہرہ ٹھہرا کر، پانچ سو روپیہ زادراہ کے طور پر دیکر کلکتے کی طرف روانہ کیا۔ گویا یہ بات ان کے کلکتہ آنے سے پہلے ہی طے ہوچکی تھی کہ وہ کلکتہ جاکر میر بہادر علی حسینی کی جگہ ہیڈ منشی بنائے جائیں گے۔

غرض ان کی زبان دانی کے چرچے سن کر کرنل اسکاٹ نے انہیں فورٹ ولیم کالج، کلکتہ جانے کو کہا۔[2] بقول وارشنے ۱۷ اکتوبر ۱۸۰۴ء کو میر بہادر علی حسینی کو میر منشی کے عہدے سے ہٹا کر مترجم کے عہدے پر فائز کیا گیا اور ان کی جگہ پر افسوس کو ہیڈ منشی بنادیا گیا۔ افسوس کا انتقال ۱۹ دسمبر ۱۸۰۹ء کو کلکتے میں ہوا۔ ان کی جگہ تارنی چرن متر ہیڈ منشی مقرر ہوئے۔ شری برجیندر ناتھ مکھوپادھیائے اپنی کتاب 'فورٹ ولیم کالجیر پنڈت' میں کالج کونسل کی کاروائی کا حوالہ دیتے ہیں جس سے پتہ چلتا ہے کہ تارنی چرن متر کی تقرری ۲۱ دسمبر ۱۸۱۰ء کو عمل میں آئی۔ (فورٹ ولیم کالجیر پنڈت، صفحہ:۱۸)

افسوس کی نثری کتابیں حسب ذیل ہیں۔

۱- **باغ اردو** : یہ سعدی کی 'گلستاں' کا ترجمہ ہے۔ خاتمے کی تاریخ افسوس نے ۱۸ ذی الحجہ ۱۲۱۶ھ مطابق ۲۱ اپریل ۱۸۰۲ء لکھی ہے۔ گلکرسٹ نے ۱۹ اگست ۱۸۰۳ء کی اس فہرست میں اسے شامل کیا ہے جو انعام کی سفارش کے لئے کونسل کو بھیجی گئی تھی۔ ''خانۂ کیفیت'' میں لکھا ہے کہ چونکہ افسوس تنخواہ دار ملازم ہے اس لئے وہ ۴۰۰ روپوں کی سفارش کر رہا ہے ورنہ ۱۰۰۰ لکھتا۔ اس کتاب کے دیباچے میں افسوس نے علمِ صرف ونحو کی تحصیل پر زور دیا ہے۔ لکھتے ہیں :

''جو کوئی چاہے کہ زبانِ اردو میں تصنیف وتالیف کرے کسی کتاب کا ترجمہ، خواہ نظم ہو یا نثر اور وہ باشندہ شاہجہاں آباد کا بھی نہ ہو تو لازم ہے اسے کہ علمِ صرف ونحو تھوڑا سا حاصل کرے اور جو اس کے ساتھ علمِ بلاغت بھی اندکے ہو تو فہوالمراد۔''[3]

۲- **آرائش محفل** : یہ منشی سجان رائے کی فارسی تصنیف 'خلاصۃ التواریخ' کا اردو ترجمہ ہے۔ افسوس نے اسے ۱۸۰۵ء میں مکمل کیا تھا۔ ''اناس آف دی فورٹ ولیم کالج'' میں ایک جگہ لکھا ہے :

۱- خوش معرکۂ زیبا۔ سعادت خاں ناصر۔ مرتبہ شمیم انہونوی۔ بار اول۔ ۱۹۷۱ء۔ صفحہ:۱۵ ۔۔۔ ۲- گلکرسٹ اور اس کا عہد۔ ص ۵۸
۳- باغ اردو۔ مرتبہ کلب علی فائق۔ ترقی ادب، لاہور، ۱۹۶۸ء

Meer Sher Ulee, the head Moonshee, in the Hindoostanidepartment of the College, having compiled and arranged in the Hindoostani language, a work on the History and Geography of India, has been encouraged by the college to print it for publication.

اس کتاب میں ہندوستان کی مختلف ریاستوں کا حال بیان کیا گیا ہے۔ مثلاً صوبہٴ بنگالہ کے سلسلے میں لکھتے ہیں :

''جہانگیر نگر عرف ڈھاکہ، ایک بڑا شہر، آبادی و خوش آبادی میں بمراتب بہتر۔ ہر ملک کی اشیاء اس میں ہر وقت مہیا۔ ہر قوم و اقلیم کے لوگ اس میں ہزارہا۔ اصل نام اس کا بنگ تھا۔ لفظ آل کہ اس سے ملا۔ وجہ اس کی یہ ہے کہ بنگلہ زبان میں آل بڑے پشتے کو کہتے ہیں۔ اور اسے باغ و زراعت وغیرہ کے گرد پانی کی محافظت کیلئے بناتے ہیں۔ چنانچہ اگلے زمانے میں اس ملک کے زمیندار دامنِ کوہ میں کہ زمین دھان کی نیچی ہوتی ہے، دس بیں ہاتھ کے اونچے اور آٹھ آٹھ ہاتھ کے چوڑے پشتے بنا کر مکان کی بنیاد ان کے اندر ڈالتے تھے اور کھیتیاں بھی اسی طور پر کرتے تھے۔ بنا پر اسکے یہاں کے عوام نے اس ملک کا نام بنگالہ رکھ دیا۔'' [1]

چند دوسری کتابوں کے ترجمے میں بھی وہ شریک تھے۔

تارنی چرن متر

بقول برجیندر ناتھ بندھو پادھیائے تارنی چرن متر کی پیدائش ۲۴ر مئی ۱۷۷۲ء میں ہوئی۔ کلکتہ میں شالی شملہ یا پرانے شملہ کے علاقے میں رہتے تھے۔ ۴ر مئی ۱۸۰۱ء کو کالج کمیٹی کے اجلاس میں مختلف شعبوں میں پنڈتوں اور منشیوں کی تقرری ہوئی۔ تارنی چرن متر سو روپے ماہانہ پر سکنڈ منشی مقرر ہوئے۔

۱- آرائش محفل۔ کلکتہ پریس۔ ۱۸۷۱ء۔ صفحہ ۱۱۰

تارنی چرن متر بڑے عالم شخص تھے۔ ۱۹ر دسمبر ۱۸۰۹ء میں منشی شیر علی افسوس کا انتقال ہوا اور وہ ان کی جگہ پر ۲۱ر دسمبر ۱۸۱۰ء سے ہیڈ منشی ہوئے۔ کالج کمیٹی کی کاروائی میں درج ہے :

At a council held on 1. Feb. 1810, Meer Sher Ulee Ufsos head Moonshee in the Hindustani Dept. having departed this life on the 19th Dec. 1809., - Resolved that the following promotions and appointments in the Dept. take effect from 21 December in the room of Sher Ulee deceased. (1)

تارنی چرن متر ۱۸۳۰ء تک ہندوستانی شعبے سے منسلک رہے۔ ۵۸ سال کی عمر میں ماہانہ ایک سو روپے پنشن پر ریٹائر ہوئے۔ لکشمی ساگر وارشنے سرکاری کاغذات کے حوالے سے لکھتے ہیں کہ روڈل نے پنشن پانے والے ہندوستانی منشیوں کا حلیہ ان کے پروفیسروں سے مانگا تاکہ اکاؤنٹنٹ جنرل سی۔ مارٹے اور نائب خزانچی جے۔ آر۔ باروئل کے پاس بھیجا جا سکے۔ پرائس نے اپنے شعبے کے منشیوں کا جو حلیہ بیان کیا ہے، اس میں تارنی چرن متر کا حلیہ کچھ یوں بیان کیا ہے :

''تارنی چرن متر: سو روپیہ پنشن۔ عمر اٹھاون سال۔ چھوٹا قد۔ دور کی چیز نہیں دیکھ سکتے۔ تھوڑا جھک کر چلتے ہیں۔ اوپر کے ہونٹ پر اک تل ہے۔'' [2]

اسکول بک سوسائٹی کی کمیٹی آف مینیجرز میں مرتیونجوئے بدیاالنکار اور رادھا کانت دیب کے ساتھ تارنی چرن متر کا نام بھی آتا ہے۔ تارنی چرن دیسی (Native) سکریٹری تھے۔ ۳۱-۱۸۳۰ء تک ان کا نام سوسائٹی کی کاروائی میں ملتا ہے۔ اس سوسائٹی کا مقصد بقول بندھو پادھیائے نصابی کتابوں کی اشاعت اور ان کی مفت تقسیم تھی۔ تارنی چرن کلکتہ دھرم سبھا کے بھی سرگرم رکن تھے۔ ۴ر دسمبر ۱۸۲۹ء کو گورنر جنرل لارڈ ولیم بینٹنگ نے ستی کے خلاف آئین جاری کیا تھا۔ اس آئین کے خلاف جنھوں نے درخواست دی تھی، ان میں ایک نام تارنی چرن متر کا بھی تھا۔ جب اس درخواست پر عمل درآمد نہ ہوا تو سنسکرت کالج میں ایک میٹنگ بلائی گئی اور وہیں کلکتہ کے اہم بنگالی اور

۱- فورٹ ولیم کالج پنڈت۔ (بنگلہ) از شری برجیندر ناتھ بندھو پادھیائے۔ بنگیہ ساہتیہ پریشد۔ کلکتہ۔ بیساکھ ۱۳۴۹، صفحہ ۱۹

۲- فورٹ ولیم کالج۔ لکشمی ساگر وارشنے۔ الہ آباد یونیورسٹی، سمبت ۲۰۰۴، ص ۱۳۷

ہندوستانی اشخاص نے ملکر دھرم سبھا کی بنیاد ڈالی۔

فورٹ ولیم کالج سے ریٹائر کرنے کے بعد آپ نے ۱۸۳۲ء میں رادھا کانت دیب کی مدد سے کاشی کے راجہ کے دربار میں نوکری کرلی تھی۔ بعد میں بنارس کے کمشنر ہوگئے تھے۔ برجیند رناتھ بندھو پادھیائے نے تارنی چرن متر کو لکھے گئے ان خطوط کے حوالے سے بات کی ہے، جو ۳۴-۱۸۳۲ء کے درمیان انہیں رادھا کانت دیب نے تحریر کئے تھے۔ ۱۳راگست ۱۸۳۲ء کے خط میں لکھا ہے :

> My dear Dada, I beg to acknowledge the receipt your letter of 11th ultimo and am sorry to learn that you suffered much in your way from the inclemency of the weather, I am very glad to hear that the Rajah received you with great respect...........I received a letter from the Rajah, in which, I am happy to inform you, he highly applauds your great talents. (1)

تارنی چرن متر کی صلاحیتوں کا گلکرسٹ بھی قائل تھا۔ تارنی فارسی، اردو، بنگلہ اور انگریزی پر خاصی دسترس رکھتے تھے۔ The Oriental Fabulist کے ترجمے میں بنگلہ، فارسی اور ہندی کے تراجم آپکی کوششوں کا نتیجہ ہیں۔ کتاب کے پیش لفظ میں گلکرسٹ کہتا ہے :

> It behoves me now more particularly to specify that toTarnee Churun Mitr's special patient labour and considerable proficiency in the English tongue and am greatly indebted for the accuracy and dispatch, with which the collection has at last completed. (2)

تارنی چرن متر نے کلکتہ بک سوسائٹی کے لئے بھی اردو اور ہندی میں کتابیں لکھی تھیں۔

۱- فورٹ ولیم کالیج پنڈت۔ (بنگلہ) از شری برجیند رناتھ بندھو پادھیائے۔ بنگیہ ساہتیہ پریشد۔ کلکتہ۔ بیسا کھ ۱۳۳۹ صفحہ ۲۰

۲- ایضاً صفحہ ۲۰

۱۸۱۸ء میں انہوں نے رادھا کانت دیب اور رام کمل سین کے ساتھ ملکر انگریزی و عربی سے ۳۱ کہانیوں کا بنگلہ میں ترجمہ کیا تھا۔ اور 'نیتی کتھا' کے نام سے شائع بھی کیا تھا۔ یہ کتاب بہت مقبول ہوئی تھی۔ پہلی بار ۵۰۰ کی تعداد میں چھپی تھی۔ دوسری بار ۱۵۰۰، اور تیسری بار ۴۰۰۰ چھپی۔ برجیند رناتھ بندھو پادھیائے اسکول بک سوسائٹی کی کاروائی کی رپورٹ کے حوالے سے کہتے ہیں کہ تارنی چرن متر نے نیتی کتھا کا اردو ترجمہ بھی کیا تھا نیز یہ کہ نیتی کتھا کا دوسرا حصہ بھی شائع ہوا تھا۔ متر کی دوسری کتابیں درج ذیل ہیں :

۱- **پرش پریکچھا** : اس میں اخلاقی کہانیاں ہیں جو سنسکرت سے آسان اردو میں منتقل کی گئی ہیں۔ یہ کلکتہ سے ۱۸۱۳ء میں شائع ہوئیں۔ اس کا بنگلہ ترجمہ ہری پرشاد نے کیا تھا۔

۲- **نقلیات لقمانی** : یہ Aesop's Fables اور دوسرے قدیم انگریزی قصوں کا ترجمہ ہے۔ بقول ڈاکٹر گیان چندجین :

> "اسکے مترجمین ہیں تارنی چرن متر، مولوی امانت اللہ، پنڈت سدل مشر بہادر علی حسینی، شیر علی افسوس، اور غلام اشرف۔ یہ کتاب ۳۰۰ صفحات پر مشتمل تھی اور ۱۸۰۳ء میں شائع ہوئی تھی۔"[۱]

یہ چھوٹی چھوٹی حکایتیں ہیں جو فارسی عربی، برج بھاشا، بنگلہ، سنسکرت وغیرہ میں ترجمہ کی گئی ہیں۔ یہ کتاب ۱۸۰۳ء میں رومن رسم الخط میں شائع ہوئی تھی۔ ۱۹راگست ۱۸۰۳ء کو کالج کونسل کے سامنے انعامات کی سفارش کرتے ہوئے جو فہرست گلکرسٹ نے پیش کی تھی، ان میں ایک یہ کتاب بھی ہے۔

۳- **خلاصتہ الحساب** : یہ روشن علی انصاری جونپوری کے اسی نام کی فارسی کتاب کا ترجمہ ہے۔ جان علی اور غلام علی نے تصحیح و نظر ثانی کا کام کیا تھا۔

۴- **کھڑی بولی کی کہانیاں** : کہانیوں کے اس مجموعے کو رو بک نے ترتیب دینا شروع کیا تھا۔ اس کے انتقال کے بعد تارنی چرن متر نے مکمل کیا۔ اس کے علاوہ بھی تارنی چرن متر نے کالج کی دوسری کتابوں کی ترتیب و تدوین میں مدد کی تھی۔

مرزا کاظم علی جواں

مرزا کاظم علی جواں کے تفصیلی حالات دریافت نہیں ہیں۔ اکثر تذکروں میں انہیں شاعری

۱- اردو کی نثری داستانیں۔ انجمن ترقی اردو۔ پاکستان۔ ۱۹۶۹ء۔ صفحہ ۲۳۲

حیثیت سے شامل کیا گیا ہے۔ گلزارِ ابراہیم، دیوانِ جہاں، طبقات الشعرائے ہند وغیرہ میں ان کے حالات بہت مختصراً بیان کئے گئے ہیں اور نمونے کے طور پر اشعار پیش کئے گئے ہیں۔ اس سے ان کے شاعرانہ قد کا اندازہ پورے طور پر نہیں ہوتا۔ 'دیوانِ جہاں' سے پتہ چلتا ہے کہ ان کے دو بیٹے تھے جو شاعر تھے۔ مرزا قاسم علی ممتاز بڑے تھے اور ہاشم علی عیاں چھوٹے۔ ان دونوں کا ذکر اصل تذکرے میں نہیں ہے بلکہ اس طرحی مشاعرے کے ضمن میں ہے جو ۲۵ جولائی کو فورٹ ولیم کالج کے زیرِ اہتمام ہوا تھا۔ بینی نرائن نے انکے بڑے بیٹے مرزا قاسم علی ممتاز کی وہ غزل درج کی ہے جو انہوں نے فورٹ ولیم کالج کے مشاعرے میں ۲۵ جولائی کو پڑھا تھا۔ اس کا مقطع ہے :

شوقِ یک رنگی ترے دل میں جو ہے ممتاز تو
یاد میں اس کی دو عالم کو بھلایا چاہئے

جواں کے بارے میں لکھتے ہیں :

''جواں تخلص۔ نام میرزا کاظم علی۔ دلّی کے رہنے والے ہیں۔ کلکتے میں تشریف رکھتے ہیں اور اس فقیر کو بھی انکی خدمتِ عالی میں نہایت بندگی ہے۔

یہ ان سے ہے :

دیکھ داغِ عشق دل میں فکر نے دیواں کیا ہم نے وہ خورشید تاباں مطلعِ دیواں کیا

'شکنتلا' کے دیباچے میں کاظم علی جواں نے اپنے متعلق جو کچھ بتایا ہے اس سے ہم اس نتیجے پر پہنچتے ہیں کہ انہوں نے قرآن شریف کے ہندی ترجمے کا محاورہ درست کرنے کا کام کیا تھا۔ شکنتلا انہوں نے گلکرسٹ کی فرمائش پر کیا تھا۔ اس کام میں للوجی لال کب نے ان کا ہاتھ بٹایا تھا۔ ان سے کچھ اور کتابیں منسوب ہیں، جیسے 'بارہ ماسہ'، 'سنگھاسن بتیسی' اور 'تاریخ فرشتہ'۔

۱- **شکنتلا** : گرچہ اسے ناٹک کا نام دیا گیا ہے لیکن یہ ناٹک نہیں ہے بلکہ قصے کے طور پر بیان کیا گیا ہے۔ عبادت بریلوی نے اسے مرتب کر کے اشرف پریس، لاہور سے ۱۹۶۳ء میں طبع کرایا ہے۔ کاظم علی جواں نے شکنتلا کے دیباچے میں بتایا ہے کہ بارہ ماسہ سے قبل وہ دو کتابیں تحریر کر چکے ہیں۔ عبادت بریلوی ان میں سے ایک شکنتلا کو مانتے ہیں اور دوسری کے متعلق ان کا خیال ہے کہ غالباً تاریخ فرشتہ کا وہ ترجمہ ہے جو دکن کے سلاطینِ بہمنیہ کے متعلق ہے۔

شکنتلا میں کئی کردار ہیں۔ کہانی وشوامتر منی، مینکا، ان کی بیٹی شکنتلا اور راجہ دشینت کے گرد گھومتی ہے۔ شکنتلا میں جواں نے سلیس اور رواں زبان استعمال کی ہے۔ کہیں کہیں دکنی انداز میں آئیاں اور جائیاں کا بھی استعمال کیا ہے۔

۲- **سنگھاسن بتیسی** : شاہجہاں کے عہد میں سندر کبیشور نے سنسکرت سے برج بھاشا میں منتقل کیا تھا۔ گلکرسٹ کی فرمائش پر کاظم علی جواں نے اس کا اردو ترجمہ کیا تھا۔ للوجی لال نے اس سلسلے میں ان کی مدد کی تھی۔ یہ ۱۸۰۵ء میں ناگری لپی میں کلکتہ سے شائع ہوئی تھی۔

۳- **بارہ ماسہ یا دستور ہند** : یہ منظوم ہے۔ سالِ تکمیل ۱۸۰۳ء ہے۔ یہ کتاب ۱۸۱۲ء میں ہندوستانی پریس سے شائع ہوئی۔

۴- **تاریخ فرشتہ یا تاریخ بہمنی** : یہ سلاطینِ بہمنیہ سے متعلق ہے۔ ۱۸۰۷ء میں مکمل ہوئی۔ لیکن طباعت کے مراحل سے نہیں گذری۔

اس کے علاوہ انکی شاعرانہ صلاحیتوں سے فائدہ اٹھاتے ہوئے کالج نے انہیں میر و سودا کے کلام کا انتخاب ترتیب دینے کے کام پر بھی لگایا، نیز قرآن کے ترجمے میں بھی انہوں نے ہاتھ بٹایا تھا۔

مظہر علی خاں ولا

مظہر شاعر تھے اور ولا تخلص رکھتے تھے۔ 'دیوانِ جہاں' میں انہی پر شعراء کا تذکرہ ختم ہوتا ہے۔ اس کے بعد طرحی مشاعرے میں حصہ لینے والوں کا نام اور کلام درج ہے۔ ولا کا نام اور کلام دونوں جگہ پہ درج ہے۔ اصل تذکرہ میں ولا کے بارے میں لکھا ہے :

''ولا تخلص۔ نام مرزا لطف علی۔ عرف مظہر علی خاں۔ کلکتے میں تشریف رکھتے ہیں۔ ان سے یہ ہے :

انس و جاں مشتاق ہیں مکھڑا دکھایا چاہئے اے پری رو چہرے سے برقع اٹھایا چاہئے

تذکروں سے پتہ چلتا ہے کہ ولا کے والد کا نام سلیمان عرف مرزا محمد زماں وداد تھا اور دادا کا نام آقا محمد حسین اصفہانی المخاطب بہ علی قلی خاں۔ مصحفی نے ولا کو جوان، حلیم و سلیم بتایا ہے۔ مصحفی (تذکرۂ ہندی) کے مطابق ولا، نظام لدین ممنون سے اصلاح لیتے تھے۔ دلّی کے رہنے والے تھے۔ ہمیشہ عمدہ منتخبہ تھے۔ 'ہفت گلشن' کے دیباچے میں انہوں نے خود کو شاعر بتایا ہے۔ ولا فورٹ ولیم

کالج سے غالباً نومبر ۱۸۰۰ء سے وابستہ ہوئے جب انہیں کرنل اسکاٹ نے منتخب کر کے لکھنؤ سے کلکتہ بھیج دیا تھا۔ وارشنے نے ولا کی تقرری کی تاریخ ۲۷ر نومبر ۱۸۰۱ء درج کیا ہے (فورٹ ولیم کالج، صفحہ: ۱۹) دو برس بعد انہیں زائد قرار دے کر کالج سے برخاست کر دیا گیا۔ تاہم ان کی برطرفی کے معاملے پر دوبارہ غور کیا گیا اور ۴ر اکتوبر کی تاریخ میں اس فیصلے کو منسوخ کر دیا گیا۔ ولا کا انتقال غالباً ۱۸۱۶ء کو ہوا۔ وارشنے کا کہنا ہے :

''کورٹ کے ۹ مئی ۱۸۱۵ء کے خط میں جو کونسل کو ۸ر جنوری ۱۸۱۶ء کو ملی، اسسٹنٹ پروفیسروں کو ہٹانے کی اجازت دے دی گئی... اس وقت مظہر علی کا انتقال ہو چکا تھا۔''[1]

درج ذیل تصانیف آپ سے وابستہ ہیں۔

۱- **ھفت گلشن** : یہ ناصر علی خاں واسطی بلگرامی کی فارسی ہفت گلشن کا اردو ترجمہ ہے۔ ۱۸۰۱ء میں مکمل ہوئی۔ ڈاکٹر عبادت بریلوی نے اسے مرتب کر کے ۱۹۶۴ء میں اردو دنیا، کراچی سے شائع کروایا۔ یہ ایک مختصر سی کتاب ہے، جس کا موضوع اخلاق اور پند و نصائح ہے۔ کتاب سات حصوں پر مشتمل ہے۔ ہر حصے کا نام ایک گلشن کے طور پر رکھا گیا ہے۔

۲- **مادھو نل اور کام کنڈلا** : اسے برج بھاشا سے اردو میں منتقل کیا گیا۔ ترجمہ ۱۸۰۱ء میں ہوا۔ گلکرسٹ نے بیاضِ ہندی میں اس کا ایک حصہ ۱۸۰۳ء میں چھاپا تھا۔ وارشنے اسے للوجی لال اور ولا کی مشترکہ تصنیف بتاتا ہے۔ اس میں مادھو برہمن اور ایک رقاصہ کے عشق کا قصہ بیان ہوا ہے۔ 'مادھونل اور کام کنڈلا'، 'انالس آف دی کالج آف فورٹ ولیم' کے اپنڈکس میں فورٹ ولیم کالج کی مطبوعہ کتابوں کی فہرست شامل ہے۔ 'ہندی مینوئل' کے نام سے چھپے انتخاب میں 'مادھونل اور کام کنڈلا' بھی شامل ہے۔ لیکن راقم الحروف کو اسکی کوئی کاپی نہیں مل سکی۔ ولا شاعر بھی تھے۔ ان کا شعری مجموعہ ایشیاٹک سوسائٹی آف بنگال کے کتب خانے میں موجود ہے۔

۳- **بیتال پچیسی** : اس میں راجہ بکرماجیت کے عہد کے قصے ہیں۔ سورت کبیشور نے سنسکرت سے برج میں ترجمہ کیا تھا اور ولا نے برج سے اردو میں منتقل کیا۔ اس کے ترجمے میں للو جی لال کا تعاون شامل تھا۔ اس میں پچیس کہانیاں ہیں۔ یہ کہانیاں بیتال نے بکرم سے کہی تھیں۔

[1] فورٹ ولیم کالج کی کہانی، ساگر وارشنے، الہ آباد یونیورسٹی، سمبت ۲۰۰۴ء، ص: ۸۹

۴- **جھانگیر شاھی** : یہ فارسی اقبال نامۂ جہانگیری کا ہندوستانی ترجمہ ہے مظہر علی خاں ولا نے یہ ترجمہ کپتان جیمس موئٹ کی فرمائش پر ۱۸۰۹ء میں کیا تھا۔ اس میں مغل بادشاہ جہانگیر کے عہدِ حکومت اور فتوحات کا بیان ہے۔ اس کا خطی نسخہ ایشیاٹک سوسائٹی آف بنگال میں موجود ہے۔ دیباچہ میں ولا اپنے بارے میں کچھ یوں بتاتے ہیں :

''حقیر مظہر علی جو سلمان علی خاں کا چھوٹا بیٹا اور پوتا آقا محمد حسین اصفہانی کا ہے اور پرپوتا (پرپوتا) آقا صادق ترک کا، یہ بیان کرتا ہے جب وہ دونوں بزرگوار ولایتِ اصفہان سے شاہ جہاں آباد آئے شدہ شدہ آقا محمد حسین نے نواب نصیر الدین خان بہادر مہر آتش غفراں پناہ کی وساطت سے سنہ ا میں فردوس آرام گاہ محمد شاہ بادشاہ کا شرف ملازمت حاصل کیا۔'' (دیباچہ، قلمی نسخہ جہانگیر شاہی)

۵- **تاریخ شیر شاھی** : 'تاریخ شیر شاہی' عباس خاں سروانی کی فارسی کتاب 'تحفۂ اکبر شاہی' کا اردو ترجمہ ہے۔ ولا نے اسے بھی کیپٹن موئٹ کی تحریک پر ترجمہ کیا تھا۔ دیباچے میں ولا لکھتے ہیں :

''بعد حمد و نعت کے مظہر علی خاں ولا سبب ترجمہ بیان کرتا ہے کہ اس احقر کو صاحب عالی مکنت والا حشمت کپتان جیمس موئٹ صاحب دام دولتہ نے از راہِ نوازش یوں ارشاد کیا کہ شیر شاہی کا ترجمہ زبانِ اردو میں کہ جس طرح عباس خاں لکھو سروانی نے بموجب حکمِ اشرف عرش بارگاہ سلیمان جاہ جلال الدین محمد اکبر بادشاہ غازی کے کتاب تاریخِ احوال میں حضرت ہمایوں بادشاہ وغیرہ کے فارسی میں لکھی، اس ہیچمداں نے ترجمہ اس کا حسب الحکم صاحبِ ممدوح کے عصر میں... مارکوئس ولزلی گورنر جنرل بہادر دام اقبالہٗ کے حسنِ انصرام کو پہنچایا۔'' (قلمی نسخہ تاریخ شیر شاہی، ایشیاٹک سوسائٹی آف بنگال)

ولا نے تیسرے حصے کا ترجمہ کیا ہے، جس میں شیر شاہ سوری کے عہد حکومت میں ہونے والی خانہ جنگیوں اور ہمایوں کے ساتھ شیر شاہ کی معرکہ آرائیوں کا احاطہ کیا گیا ہے۔

'تاریخ شیر شاہی' کے متعلق ڈاکٹر سمیع اللہ (مصنف 'فورٹ ولیم کالج: ایک مطالعہ') کہتے ہیں

کہ 'یہ ہنوز شائع نہ ہو سکی'۔ جبکہ ڈاکٹر سید معین الحق نے اسے ۱۹۶۳ء میں سلمان اکیڈمی، کراچی سے شائع کر دیا ہے۔

میر امنؔ

میر امنؔ لطف دِلّی کے رہنے والے تھے۔ آپ کی زندگی کے مفصل حالات دستیاب نہیں ہیں۔ آپ نے 'باغ و بہار' کے دیباچے میں اپنے بارے میں جو لکھا ہے اس کی روشنی میں کہا جا سکتا ہے کہ میر امن کے بزرگ 'ہمایوں بادشاہ کے عہد سے ہر ایک بادشاہ کی رکاب میں پشت بہ پشت جاں فشانی بجالاتے رہے اور وہ بھی پرورش کی نظر سے قدر دانی جتنی چاہیے فرماتے رہے۔ جاگیر و منصب اور خدمات کی عنایات سے سرفراز کر کے مالا مال اور نہال کر دیا'۔ لیکن قسمت کی خرابی کہ سورج مل جاٹ نے جاگیر ضبط کر کیا اور احمد شاہ درانی نے گھر بار تاراج کر دیا۔ ناچار دلی چھوڑ کر عظیم آباد آ گئے۔ وہاں بھی کچھ بن نہ پڑا۔ عیال و اطفال کو چھوڑ کر تن تنہا کشتی پر سوار ہوئے اور اشرف البلاد کلکتے میں آب و دانے کے زور سے آ پہنچے۔ کہتے ہیں :

> ''چندے بے کاری گذری۔ اتفاقاً نواب دلاور جنگ نے بلوا کر اپنے چھوٹے بھائی میر محمد کاظم خاں کی اتالیقی کے واسطے مقرر کیا۔ قریب دو سال کے وہاں رہنا ہوا۔ لیکن نباہ اپنا نہ دیکھا۔ تب منشی بہادر علی جی کے وسیلے سے حضور تک جان گلکرسٹ صاحب دام اقبالہ تک رسائی ہوئی۔ بارے طالع کی مدد سے ایسے جواں مرد کا دامن ہاتھ لگا ہے۔ چاہیے کہ دن کچھ بھلے آویں۔ نہیں تو یہ بھی غنیمت ہے کہ ایک ٹکڑا کھا کر پاؤں پھیلا کر سو رہتا ہوں اور گھر میں دس آدمی چھوٹے بڑے پرورش پا کر دعا اس قدرداں کو کرتے ہیں۔ خدا قبول کرے۔''
>
> (دیباچہ باغ و بہار)

میر امن کے اس بیان کے پیش نظر ممتاز حسینؔ مقدمہ 'باغ و بہار' میں لکھتے ہیں کہ :

> ''تاریخی واقعات کے تسلسل کو دھیان میں رکھیں تو اس اعتبار سے میر امن ۱۷۶۱ء میں دِلّی سے جلاوطن ہوئے۔'' (دیباچہ باغ و بہار، مرتبہ سلیم اختر)

میر امن کی تاریخِ پیدائش و وفات کا کسی کو علم نہیں۔ انہوں نے اپنی زندگی کے آخری ایام

کہاں گذارے، اسکے متعلق بھی کچھ پتہ نہیں چلتا۔ بقول ممتاز حسینؔ ان کا انتقال ۱۸۰۶ء میں ہوا ہے۔ ڈاکٹر وحید قریشی کے مطابق ۱۸۰۶ء کے بعد کی کالج کارروائیوں میں ان کا نام نہیں ملتا۔ [۱]

میر امن کی صرف دو کتابوں کا پتہ چلتا ہے جو انہوں نے فورٹ ولیم کالج کیلئے لکھی تھیں اور وہ ہیں 'باغ و بہار' اور 'گنج خوبی'۔

۱- **باغ و بہار** : میر امن کی تقرری فورٹ ولیم کالج میں ۴ رمئی ۱۸۰۱ء کو ۴۰ روپے ماہوار پر ماتحت منشی کی حیثیت سے ہوئی۔ (فورٹ ولیم کالج، وار ثنیؔ، صفحہ: ۲۲)۔ گلکرسٹ نے انہیں 'قصہ چہار درویش' کا ترجمہ کرنے کیلئے کہا۔ اس سے پہلے عطا حسین تحسینؔ اسے نوطرزِ مرصع کے نام سے کر چکے تھے تاہم عربی و فارسی کے ادق الفاظ کی وجہ سے یہ تصنیف مقبولِ عام نہ ہو سکی تھی۔ گلکرسٹؔ نے میر امن سے اسے ٹھیٹھ ہندوستانی گفتگو میں کرنے کیلئے کہا۔ اس حکم کے بموجب میر امن نے اسے اسی محاورے سے لکھنا شروع کیا جیسے کوئی باتیں کرتا ہے۔ [۲]

عتیق صدیقی بلوم ہارٹ کے حوالے سے لکھتے ہیں کہ 'چار درویش ۱۸۰۱ء میں مکمل ہو چکی تھی اور چھاپہ خانے کے سپرد بھی کی جا چکی تھی لیکن بعض وجوہ کی بنا پر دوسری کتابوں کے ساتھ اس کی اشاعت بھی روک دی گئی۔ اس موقع سے فائدہ اٹھاتے ہوئے میر امن نے اس کے مسودے پر نظر ثانی کر کے اس کو باغ و بہار بنایا اور اس مناسبت سے اس کا سنہ تالیف ۱۸۰۲ء قرار پایا۔ [۳]

'انالس آف دی کالج آف فورٹ ولیم' میں مطبوعہ کتابوں کی جو فہرست دی گئی ہے اس کے مطابق 'دی ہندی مینول' یا Casket of India میں جن کی تصانیف کے حصے شامل ہیں، ان میں ایک 'باغ و بہار' ہے اور مصنف کا نام میر امن لطف لکھا ہے۔ اس فہرست میں 'باغ و بہار' کا سنہ تصنیف ۱۸۰۴ء دکھایا گیا ہے۔ اسی فہرست میں دوسرا ایڈیشن ۱۸۱۳ء دکھایا گیا ہے۔ [۴]

'باغ و بہار' میں ملک یمن کے بادشاہ جواں بخت اور چار درویشوں کی کہانی ہے۔ اس کی زبان صاف اور رواں ہے۔

۲- **گنج خوبی** : یہ ملا حسین واعظ کاشفی کی فارسی تصنیف اخلاقِ محسنی کا اردو ترجمہ ہے۔ اس کتاب کی تصنیف کا بھی یہی مقصد تھا کہ آسان زبان میں لکھی جائے تاکہ صاحبانِ عالیشان کے درس کے واسطے کام آئے۔ میر امن اس کے دیباچے میں لکھتے ہیں کہ :

۱- باغ و بہار، مرتبہ سلیم اختر، اعجاز پبلشنگ ہاؤس، نئی دہلی، ۱۹۸۹ء، صفحہ: ۲۴

۲- ایضاً ص: ۷۰-۷۱   ۳- گلکرسٹ اور اس کا عہد، صفحہ: ۱۵۴   ۴- انالس آف دی کالج آف فورٹ ولیم، صفحہ: ۲۶

''پس اب اس کتاب کے ترجمہ کرنے کی حقیقت لکھتا ہوں کہ خداوند نعمت، صاحب خلق ومروت جان گلکرسٹ صاحب نے کہ زبان اردو کے قدردان اور فلک زدوں کے فیض رسان ہیں، اس بعید الوطن میر امن دلی والے کو لطف و عنایت سے فرمایا کہ اخلاقِ محسنی جو فارسی کتاب ہے اس کو اپنی زبان میں ترجمہ کرو تو صاحبانِ عالیشان کے درس کی خاطر مدرسے میں کام آوے۔ بموجب حکم ان کے سر آنکھوں سے قبول کیا۔ اس لئے کہ مرہون انکے احسان کا ہوں۔ آدمی سر سے ایک تنکا اتارنے کا احسان یاد رکھتا ہے۔ انہوں نے تو روزی میں لگا دیا اور میں نے بھی انہیں کے سبب سے یہ پیشہ قبول کیا۔'' [1]

دیباچے میں میر امن نے شہر کلکتہ کی تصویر کشی کی ہے اور قلعہ فورٹ ولیم کے اطراف کا خاص طور سے بیان کیا ہے۔ ان کے لب و لہجے سے کلکتہ کے تئیں ان کی لگاوٹ کا پتہ چلتا ہے۔ لکھتے ہیں:

''اشرف البلاد کلکتے میں حاکم نشین محل سرِ شہر مقابل قلعہ کے ایسا تعمیر فرمایا کہ آج تک ہندوستان میں اس نقشے کا مکان کسو نے نہ آنکھوں سے دیکھا اور نہ کانوں سے سنا تھا۔ اگر قلعہ کی طرف سے کھڑا ہو کر دیکھیے تو گویا شہر کی ناک ہے کہ اس کے سبب سے شہر کی صورت اور سے اور ہوگئی ہے۔ یا یہ بات دھیان میں ٹھہرتی ہے کہ قلعہ بجائے سر کے ہے اور شہر جیسے دھڑ۔ اس عمارت کے بننے سے ان میں جان پڑی اور جو حویلی کی سمت سے نظر دوڑایئے تو جہاں تک نگاہ کام کرے ایک طرف سبزہ لہلہاتا ہے۔ اور دوسرے کنارے دریا لہریں کھاتا ہے۔ بلکہ دریا اس تعمیر کو دیکھ کر جو جاتا ہے اور اس کی خوبیاں سمندر کو سناتا ہے۔ تو اس کا دل بھی لہراتا ہے اور دریا کا بھیس بنا کر روز دیکھنے کو آتا ہے۔ اور مجرا کر کے چلا جاتا ہے۔ اس کو لوگ سمجھتے ہیں کہ جوار بھاٹا ہے۔'' [2]

'گنجِ خوبی' میں چالیس ابواب ہیں۔ اس کے موضوعات عبادت، اخلاق، شکر، صبر و توکل، عدالت، عفو، حلم، خیرات، امانت و دیانت، صدق وراستی وغیرہ ہیں۔ اس کی زبان بھی 'باغ و بہار' کی طرح رواں، سلیس اور بامحاورہ ہے۔

۱- دیباچہ گنجِ خوبی۔ مطبع محمدی، کلکتہ۔ باہتمام غلام حیدر ساکن ہوگلی۔ ۱۲۶۲ھ/ ۱۸۴۶ء۔ ۲- ایضاً

میر حیدر بخش حیدری

حیدر بخش حیدری کی تقرری فورٹ ولیم کالج میں ۴ر مئی ۱۸۰۱ء کو ہوئی۔ حیدری کے مفصل حالات دستیاب نہیں ہیں۔ 'تذکرہ دیوانِ جہاں' میں بنی نرائن بھی بس اتنا ہی بتاتے ہیں حیدری تخلص۔ نام میر حیدر بخش۔ دِلّی کے رہنے والے۔ بالفعل مسندِ حیات پر موجود ہیں اور اس خاکسار کو نہایت ان کی خدمت میں بندگی اور اشعار اس طرح کے کہتے ہیں۔ بیان سے ہے:

'برابری کا ترے (تری) گل نے جب خیال کیا
صبا نے مار طمانچے منہ اس کا لال کیا' [1]

اور 'تذکرہ سخن شعراء' میں نساخ لکھتے ہیں:

''حیدری تخلص۔ حیدر بخش دہلوی۔ ۱۲۱۶ھ میں کلکتہ میں موجود تھے۔ ان کی آرائشِ محفل یعنی ہفت سیر حاتم نظر سے گذری ہے۔'' [2]

تذکرہ گلشنِ ہند کے مصنف مرزا علی لطفؔ کا کہنا ہے کہ انہوں نے علی ابراہیم خاں کے فارسی تذکرہ گلزارِ ابراہیم کا صرف ترجمہ ہی نہیں کیا ہے بلکہ اس میں اضافہ بھی کیا ہے تاہم لطفؔ اپنے ہم عصر حیدریؔ کا تذکرے میں ذکر تک نہیں کرتے۔ ذاتی تعلقات کی بنا پر وہ میر شیر علی افسوسؔ کا بیان تو خوب کھل کر کرتے ہیں لیکن حیدریؔ پر ایک جملہ تک نہیں لکھتے۔ حیدریؔ نے خود کو گلِ مغفرت کے دیباچے میں سید بھی لکھا ہے۔ حیدریؔ کے بارے میں مختار الدین احمد کا کہنا ہے۔

''جن تذکروں میں حیدریؔ کا ذکر ملتا ہے، ان میں سب سے اہم تذکرہ 'ریاض الوفاق' ہے، جسکے مولف ذوالفقار علی مستؔ ہیں۔ یہ ان شعراء کا تذکرہ ہے جو بنارس اور کلکتہ میں مقیم رہے اور جنہوں نے فارسی یا اردو یا دونوں زبانوں میں شاعری کی۔ دنیا میں اس تذکرے کی صرف ایک ہی کاپی کا پتہ چلا ہے جو دوسری جنگِ عظیم سے پہلے کتاب خانہ شاہی، برلین میں تھا اور دورانِ جنگ میں جامعۂ ٹوبنگن میں منتقل کر دیا گیا۔'' [3]

'گلشنِ ہند' کے دیباچے میں حیدری نے اپنے جو کوائف بیان کئے ہیں اس سے پتہ چلتا ہے کہ ان کے مورثِ اعلیٰ نجف اشرف سے ہندوستان تشریف لائے تھے اور دِلّی میں قیام کیا۔ حیدریؔ

۱- بنی نرائن جہاں۔ دیوانِ جہاں۔ قلمی نسخہ نمبر ۵۶۔ ایشیاٹک سوسائٹی آف بنگال۔
۲- عبدالغفور خاں نساخ۔ سخن شعراء۔ اتر پردیش اردو اکادمی۔ ۱۹۸۲ء۔ صفحہ ۱۴۳

۸۳-۱۱۸۲ھ (۶۹-۱۷۶۸ء) کے لگ بھگ دلی میں پیدا ہوئے۔ دلّی میں سیاسی انتشار کو دیکھتے ہوئے انکے والد سید ابوالحسن نجفی بنارس چلے آئے اور یہیں بس گئے۔ نواب ابراہیم خاں خلیل (مصنف تذکرہ گلزارِ ابراہیم) جب ۱۷۸۱ء میں ناظمِ عدالت مقرر ہوئے تو انہون نے سید ابوالحسن کو اپنے یہاں ملازمت عطا کی۔ حیدرؔی کی ابتدائی تعلیم و تربیت نواب صاحب کے بچوں کے ہمراہ ان کے گھر پر ہی ہوئی۔ حیدری نے غلام حسین شہید اور قاضی عبدالرشید جون پوری سے کسبِ فیض کیا۔ بقول حیدری ۲۱ ر رجب ۱۲۱۴ھ کو وہ دریا کی راہ سے بنارس سے کلکتہ کے لئے روانہ ہوئے۔ یہاں پہنچ کر وہ گلکرسٹ سے ملے اور اپنی تخلیق 'مہر و ماہ' گلکرسٹ کو نذر کی۔ گلکرسٹ کو یہ داستان بہت پسند آئی اور اس نے انہیں کالج کے ہندوستانی شعبے میں منشی کی نوکری دے دی۔ ان کی تنخواہ چالیس روپے ماہوار تھی۔ کالج میں نوکری ختم ہو جانے کو بعد وہ بنارس لوٹ گئے تھے۔ غالبًا وہیں ان کا انتقال ہوا۔ جن دنوں ذوالفقار علی مستؔ اپنا تذکرہ لکھ رہے تھے ان دنوں حیدرؔی بنارس میں ہی تھے۔ مستؔ لکھتے ہیں :

> ''در مدرسۂ ہندی سرکار کمپنی انگریز بہادر مدتے بہ زمرۂ منشیانِ نوشاعر ان گزارنیدہ۔ حالا از ناموافقتِ ہوائے کلکتہ از ہوا و ہوسِ نوکری در گزشتہ باندک ادارے کہ از سرکار مقرر شدہ مکتفی شدہ در بنارس بزمِ افروزِ احباب است۔''[1]

حیدری نے درج ذیل کتابیں تصنیف کیں :

۱- آرائشِ محفل عرف قصہ حاتم طائی : آرائشِ محفل کا مآخذ عبداللہ کی تالیف حاتم نامہ (فارسی) ہے۔ اس کا موضوع حاتم طائی کی انسان دوستی اور ایثار ہے۔ وہ سات سوالوں کا جواب معلوم کرنے کیلئے سات مہمات طے کرتا ہے۔ گیان چند جینؔ، حیدرؔی کے حوالے سے اس کا سنہ تصنیف بتاتے ہیں۔ بقول حیدرؔی :

> ''۱۲۱۶ھ/۱۸۰۱ء کے موافق اور سنہ جلوس ۴۳ عالم بادشاہ غازی کے مطابق زبانِ ریختہ میں اپنی طبع کے موافق اس کتاب سے جو ہاتھ لگی تھی، مترجمۂ نثر کیا اور اسکا نام آرائشِ محفل رکھا۔ مگر اکثر اس میں اپنی طبیعت سے جہاں موافق پایا

۱- گلشنِ ہند۔ مرتبہ مختار الدین احمد۔ علمی مجلس، دہلی، ۱۹۶۷ء، صفحہ: ۱۱

> وہاں اور زیادہ کیا تا کہ قصہ طولانی ہو جائے۔''[1]

یہی سبب ہے کہ آرائشِ محفل کا قصہ خوب طولانی ہے۔ قصہ در قصہ پیش کی وجہ سے پیچیدگیوں میں کافی اضافہ ہوا ہے۔

۲- توتا کہانی : مولانا ضیاء الدین بخشی نے 'شک سپ تتی' نامی سنسکرت کتاب کا فارسی ترجمہ 'طوطی نامہ' کے نام سے (۷۳۰ھ/۱۳۲۹ء) کیا تھا۔ اس کا خلاصہ دکنی زبان میں مولوی محمد قادری نے بھی کیا تھا۔ حیدری کی توتا کہانی کا مآخذ یہی خلاصہ ہے۔ پہلی بار ناگری رسم الخط میں ۱۸۰۲ء میں اور دوسری ۱۸۰۴ء میں ہوئی۔

۳- گلدستۂ حیدری : یہ مختصر کہانیوں، غزلوں وغیرہ کا مجموعہ ہے۔ اس میں گلشنِ ہند اور لیلیٰ مجنوں کا دیباچہ بھی شامل ہے۔ یہ ۱۸۰۱ء میں مرتب ہوئی۔ بقول ڈاکٹر سمیع اللہ، عبادت بریلوی نے گلدستۂ حیدری میں شامل کہانیوں کے انتخاب کو 'مختصر کہانیاں' کے نام سے اور گلشنِ ہند کو 'تذکرۂ حیدری' کے اور غزلوں کو 'دیوانِ حیدری' کے نام سے شائع کر دیا ہے۔[2]

۴- گلشنِ ہند : یہ شعرائے اردو کا تذکرہ ہے۔ حیدرؔی کا بیان ہے کہ انہوں نے اسے بنارس سے کلکتہ جاتے ہوئے سفر کے دوران لکھا تھا۔ حیدرؔی کہتے ہیں کہ :

> ''سن بارہ سو چودہ ہجری (۱۲۱۴ھ) اکیسویں رجب کو تری کی راہ بنارس سے مرشد آباد کی طرف روانہ ہوا۔ بہ قطع منزل غازی پور کے قریب پہنچا۔ وہاں ''مرزا محمد علی، مرزا محمد فاضل کے بیٹے، دلی کے رہنے والے، سے، کہ وہ بھی کشتی میں سوار ہوئے اس سمت کو آتے تھے، ملاقات ہوئی۔ صاحب سلامت پیدا کی۔ یہاں تک کہ اکثر اوقات انکے پاس جا بیٹھا کرتا تھا۔ کبھی کبھی وہ بھی مہربانی فرماتے تھے اور طبع بھی موزوں رکھتے تھے۔ اس سبب سے ذکرِ شعر و سخن بہم ہوا کرتا تھا۔ ایک دن کہنے لگے کہ میرے ہندی کے دیوان متعدد ہیں۔ انکی سیر کرو اور اچھے اشعار ان سے منتخب کر کیا یک نسخہ بطور تذکرے کے ترتیب دو جو تمہاری یادگار رہے۔''[1]

گرچہ حیدرؔی سفر کی صعوبتوں سے پریشان تھے تاہم انہیں مرزا محمد علی کی خاطر عزیز تھی اس

۱- اردو کی نثری داستانیں، گیان چند جین، صفحہ: ۱۰۳
۲- فورٹ ولیم کالج - ایک مطالعہ، ڈاکٹر سمیع اللہ، نشاط آفسیٹ پریس، فیض آباد، ۱۹۸۹ء، صفحہ: ۱۳۳
۳- گلشنِ ہند۔ مرتبہ مختار الدین احمد۔ علمی مجلس، دہلی، ۱۹۶۷ء، صفحہ: ۱۱

لئے اشعار کا انتخاب کیا اور یوں تذکرہ گلشنِ ہند وجود میں آیا۔

۵- **گلزارِ دانش** : حیدری کی یہ تصنیف ۱۸۰۴ء میں مکمل ہوئی۔ یہ شیخ عنایت اللہ کی فارسی تصنیف 'بہارِ دانش' کا اردو ترجمہ ہے۔ اس میں جہاندار شاہ اور بہرہ ور کا قصہ بیان ہوا ہے۔ اس کا قلمی نسخہ ایشیاٹک سوسائٹی آف بنگال کے کتب خانے میں موجود ہے۔

۶- **ہفت پیکر** : نظامی گنجوی کی فارسی مثنوی کا منظوم ترجمہ ہے۔ اس میں سات داستانیں ہیں۔ بقول جاوید نہال، حیدری نے اسے ۱۸۰۵ء میں مکمل کیا تھا۔[1]

۷- **تاریخِ نادری** : اس کا خطی نسخہ ایشیاٹک سوسائٹی آف بنگال میں موجود ہے۔ فارسی میں اسے نادر شاہ کے وقائع نگار منشی محمد مہدی نے لکھا تھا۔ حیدری نے ۱۸۰۹ء میں اسکا ترجمہ مکمل کیا۔ ترجمے کی فرمائش ولیم ہنٹر نے کی تھی۔ تاریخِ نادری کی کتابت بہت سلیقے سے کی گئی ہے۔ ابتدا میں ابواب کی فہرست سازی کی گئی ہے اور اوراق وسطروں کی نشاندہی بھی ہے۔ عبیدہ بیگم نے درست فرمایا ہے کہ اس مخطوطے کے چند صفحات غائب ہیں۔ موجودہ حالت میں مخطوطے میں کل ۳۷۵ اوراق ہیں۔ ورق ۱۱۴ کے بعد ۲۰۹ آتا ہے۔[2]

۸- **گلِ مغفرت یا گلشنِ شہیداں** : یہ ملا حسین واعظ کاشفی کی فارسی کتاب کا ترجمہ ہے۔ حیدری، دیباچے میں وجہِ تصنیف بتاتے ہوئے کہتے ہیں کہ :

> ''اس حیدر بخش حیدری نے 'کتاب گلشنِ شہیداں' سے جس کو پہلے 'روضۃ الشہدا' سے زبانِ ریختہ میں ترجمہ کیا تھا، اب شہر محرم الحرام کی بیسویں تاریخ، سن بارہ سو ستائیس ہجری میں جناب فیض مآب، گلِ گلزار معانی، شمع بزم نکتہ دانی، گوہر بحرِ سیادت و امامت، سرو جویبارِ گلشن شرافت ونجابت، مولوی سید حسین علی صاحب جونپوری زاد الطافہ کے ارشاد کرنے سے جن کی خدمت فیض درجت میں اس ہیچ مداں کو ایک رسوخ دلی و نیاز باطنی ہے، اس نسخہ وہ مجلس کو انتخاب کیا اور نام اس کا گلِ مغفرت رکھا۔''[3]

گلِ مغفرت ۱۸۱۲ء میں ہندوستانی پریس، کلکتہ سے چھپی تھی۔ اس میں کربلا کے واقعہ کا بیان ہے۔ مندرجہ بالا تصانیف کے علاوہ قصہ لیلیٰ مجنوں، مہر و ماہ، جامع القوانین کا بھی ذکر ملتا ہے۔

۱- انیسویں صدی میں بنگال کا اردو ادب، ڈاکٹر جاوید نہال، صفحہ ۱۴۹
۲- قلمی نسخہ تاریخ نادری، ایشیاٹک سوسائٹی آف بنگال
۳- دیباچہ گلِ مغفرت، مجلس ترقی ادب، لاہور

تاہم تفصیلات میسر نہیں ہیں۔

بقول وارثنے حیدری کو ہفت پیکر، گلزارِ دانش، اور تاریخ نادری کے ترجمے پر دو سو، اور تین تین سو کے انعامات ملے تھے۔ (فورٹ ولیم کالج، وارثنے، صفحہ: ۷۵، ۱۰۰، ۱۰۴)

خلیل علی خاں اشک

خلیل علی خاں اشک کا تفصیلی حال ان کی کتاب 'انتخاب سلطانیہ' میں لکھتا ہے۔ یہ خطی نسخہ ایشیاٹک سوسائٹی آف بنگال میں موجود ہے اور انتہائی بوسیدہ حالت میں ہے۔ دیمک زدہ ہونے کی وجہ سے اکثر جگہ الفاظ نا قابلِ فہم ہوگئے ہیں۔ اشک لکھتے ہیں کہ :

> ''احقر العباد محمد خلیل علی خاں فیض آبادی، اشک تخلص کہ تولد.....اس کی شاہجہاں آباد...لیکن سن...کو فیض آباد میں پہنچا۔''[1]

بعد کے حالات بتاتے ہیں کہ انہوں نے یہاں عمدہ تعلیم حاصل کی اور عالم مرزا جواں بخت جہاندار شاہ کی خدمت میں پہنچے۔ انہوں نے انعامات سے نوازا۔ اس کے بعد 'سن بارہ سو نو میں آب وخور ملک میں بنگالے کے کھینچ لایا۔ بعد ازاں 'سن اٹھارہ سو ایک عیسوی کے وقت میں شاہ عالم بادشاہ غازی خلد اللہ ملکہ کے اور عصر میں مشیر خاص شاہ کیوان بارگاہِ انگلستان اشراف مارکوئس ولزلی گورنر جنرل کے کشورِ ہند کے شہر دار الخلافت کلکتے میں وارد ہوئے۔ ایک دن قاضی القضات محمد نجم الدین خاں صاحب مولوی سعید الدین صاحب سے پتہ چلا کہ صاحبانِ عالیشان نے کئی شاعر لکھنؤ سے بلوائے ہیں، ان میں ایک کاظم علی جواں بھی ہیں۔ اشک نے انہی کے فیضِ کلام سے طریقہ شعر وشاعری کا اور فنِ سخنوری کا حاصل کیا تھا، فوراً ان کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ جواں نے اس بات پر تعجب کا اظہار کیا کہ اشک اس شہر میں ہوتے ہوئے بھی اب تک گلکرسٹ سے نہیں ملے ہیں۔ جواں کے حکم کے بموجب، اشک گلکرسٹ سے ملتے ہیں۔ وہ قصہ امیر حمزہ زبانِ ریختہ میں ترجمہ کرنے کیلئے کہتا ہے۔ اشک داستان لکھنا شروع کرتے ہیں لیکن پھر گوشہ نشینی اختیار کر لیتے ہیں۔ اب کی بار مولوی سعید الدین انہیں ہربرٹ ہارنگٹن سے ملواتے ہیں۔ اس بار اشک گلکرسٹ کی خاص خدمت پر مامور ہوئے یعنی جس دن ہندی کا کلاس ہوتا تھا اسی رات کو کالج میں رات تک کھانے کے بعد وہ اشک کو لیکر اوپر مکان میں چلے جاتے اور جو کچھ وہ تقریر کرتے گلکرسٹ انگریزی میں

۱- خلیل علی خاں اشک، دیباچہ قلمی نسخہ انتخاب سلطانیہ۔ ایشیاٹک سوسائٹی آف بنگال

صاحبانِ عالیشان کو سمجھا تا جاتا۔ گویا یہ ایک طرح کا conversation class تھا اور انگریز افسروں کو' آدابِ گفتگو بزبانِ ریختہ' سکھانے کا کام ہوتا تھا۔ اس کے بعد جب یہ سلسلہ موقوف ہوا تو اشکؔ منشی بنا دئے گئے اور تب انہوں نے رات جاگ جاگ کر امیر حمزہ کی دو جلدیں اور رسالہ 'کائنات جو' کہ حکمت سے تعلق رکھتا تھا، تصنیف کر کے حضور عالی میں پیش کیا۔ اس کے بعد قصہ رضوان شاہ موسوم بہ نگار خانہ چین مسٹر ماردانت رکتس صاحب کی فرمائش پر تحریر کی۔ پھر رکتس کی ہی فرمائش پر سن ہجری بارہ سو انیس مطابق اٹھارہ سو پانچ عیسوی میں 'انتخاب سلطانیہ' مکمل کیا۔

اشکؔ کی زندگی کب اور کہاں تمام ہوئی، اس کے متعلق کوئی ٹھوس ثبوت فراہم نہیں ہوتا۔ نادم سیتاپوری اشکؔ کا سالِ وفات ۱۲۳۷ھ (۱۸۲۱ء) کے آس پاس بتاتے ہیں۔[۱]

اشکؔ نے درج ذیل کتابیں تصنیف کی تھیں۔

۱- داستانِ امیر حمزہ : بقول اشکؔ انہوں نے یہ کتاب گلکرسٹ کی فرمائش پر لکھی تھی۔ اس کتاب کے متعلق شمس الرحمٰن فاروقی کا کہنا ہے کہ :

''وہ داستان جسے خلیل علی اشک نے فورٹ ولیم کالج کے لئے فارسی سے اردو میں منتقل رترجمہ کیا (۱۸۰۱ء)، کہنے کو یہ چار جلدوں میں ہے لیکن دراصل یہ چار حصے ہیں جو ایک ہی مجلد میں بندھے ہوئے ہیں۔ اپنی اصل شکل میں اور ذرا بدلی ہوئی شکل میں بھی یہ داستان اس وقت دستیاب ہے۔ اس کی فارسی اصل کا پتہ نہیں لگ سکا ہے۔ اس کا جو نسخہ پیش نظر ہے وہ مطبع چیون پرکاش، دہلی کا چھپا ہوا ہے۔ (تاریخِ اشاعت ندارد)''[۲]

فاروقیؔ نے The Hindee Story Teller جلد دوم کے صفحہ iii پر گلکرسٹؔ کے مطبوعہ بیان کے پیشِ نظر خلیل علی خاں اشکؔ کو مترجم سے زیادہ 'قصہ گو' مانا ہے اور ان کا خیال ہے کہ اشکؔ کی داستانِ امیر حمزہ فارسی قصے کا ہو بہو ترجمہ ہونے کے بجائے اشکؔ کی ذہنی اختراع کی غماز ہے۔ بہر حال، اس کے اہم کرداروں میں عمرو عیار خاصی دلکشی رکھتا ہے۔ عام قصوں کی طرح اس میں بھی محیر العقول واقعات بیان کئے گئے ہیں۔

۲- قصۂ رضوان شاہ : یعنی نگار خانہ چین ۱۸۰۴ء میں مکمل ہوئی۔ اس میں

۱- فورٹ ولیم کالج اور اکرام علی، نادم سیتاپوری، صفحہ ۳۶۰
۲- شمس الرحمٰن فاروقی۔ ساحری، شاہی، صاحب قرانی: داستان امیر حمزہ کا مطالعہ، جلد اول۔ ۱۹۹۹ء، صفحہ ۳۸

رضوان شاہ اور روح افزا کے عشق کا قصہ بیان ہوا ہے۔ اس کتاب پر اشکؔ کو ستر روپے کا انعام ملا تھا۔ اس کا قلمی نسخہ ایشیاٹک سوسائٹی آف بنگال میں موجود ہے۔ یہ مخطوطہ ۱۲۴ صفحات پر مشتمل ہے۔ دیباچے میں اشکؔ کہتے ہیں کہ انہوں نے یہ قصہ ماردانت رکتسؔ صاحب کی فرمائش پر لکھا ہے۔ دیباچے سے کاظم علی جوانؔ کے لئے اشکؔ کی بے پناہ محبت اور عقیدت کا اندازہ ہوتا ہے۔ ان کا کہنا ہے کہ اگر کسی صاحب کو کوئی لفظ سمجھ میں نہ آئے تو جوانؔ اس لفظ کے معنی سمجھانے کے لئے سب سے بہتر ہیں۔ لکھتے ہیں :

''اگر اس کتاب میں کوئی لفظ مشکل نکلے کہ اس کے معنی حل نہیں ہو سکتے ہوں تو ملوک الکلام، دل آرام، مجمع البحرین، شاعرِ زماں یعنی مرزا کاظم علی جوانؔ کہ سرکار میں کمپنی بہادر اقبالہ کی متعلق ہیں چنانچہ گلستانِ روزگار میں زبانِ خلق کل کی مانند اس طوطیٔ گلزار معانی کی تعریف میں اغلب ہے کہ ان سے وہ کلمہ دریافت ہو۔''[۱]

۳- رسالہ کائنات جو : اشکؔ نے رسالہ کائنات جو بھی تصنیف کیا تھا۔ بقول جاوید نہال' کلکتے میں اس کی کوئی بھی مطبوعہ یا غیر مطبوعہ کاپی موجود نہیں ہے۔ اس کا ایک خطی نسخہ لندن کی رائل ایشیاٹک سوسائٹی میں موجود ہے۔' (بیسویں صدی میں بنگال کا اردو ادب، صفحہ: ۲۵۳)

۹ راگست ۱۸۰۳ء کو گلکرسٹ نے ہندوستانی مصنفین کی کتابوں کی جو فہرست انعام کے لئے کالج کونسل کے سامنے پیش کی تھی اس میں یہ رسالہ بھی شامل تھا۔ (گلکرسٹ اور اس کا عہد، از محمد عتیق صدیقی، صفحہ: ۱۷۲)

خلیل علی خاں اشکؔ نے 'انتخاب سلطانیہ' کے دیباچے میں بھی اس کا ذکر کیا ہے۔ لکھتے ہیں:

''بموجب صاحب موصوف کے فرمانے سے اس عرصۂ فرصت میں اپنے صاحب کے پڑھانے اور سرکار کی فرمائشات بجالانے کے بعد راتوں کو محنت کر کے دو جلدیں امیر حمزہ کے قصے کی کہیں اور رسالہ کائنات جو کا کہ فنِ حکمت سے تعلق رکھتا ہے تصنیف کر کے حضور عالی میں گذرانا۔''[۲]

۴- انتخاب سلطانیہ : اشکؔ نے 'انتخاب سلطانیہ' مسٹر ماردنت رکتس صاحب

۱- دیباچہ قصہ رضوان شاہ (قلمی نسخہ) ایشیاٹک سوسائٹی آف بنگال
۲- قلمی نسخہ انتخاب سلطانیہ

کی فرمائش پر ۱۲۱۹ھ مطابق ۱۸۰۵ تحریر کیا تھا۔ اشک کہتے ہیں :

''صاحبِ عالی قدر کی یہ فرمائش تھی کہ ابتدائے بنیادِ دلی سے سن حال تک شاہ عالم کے شہر مذکور میں کتنے بادشاہ ہوئے، اس احوال کو لکھو۔ سو احقر نے یہ کتاب لکھی اور نام اس کا انتخاب سلطانیہ رکھا کیونکہ تاریخ بھی اس کی یہی پائی۔''[۱] (قلمی نسخہ انتخاب سلطانیہ، دیباچہ)

اس کتاب پر اشک کو ستر روپے بطور انعام ملے تھے۔

'انتخاب سلطانیہ' کا قلمی نسخہ بہت بوسیدہ حالت میں ایشیاٹک سوسائٹی آف بنگال میں موجود ہے۔

۵- **واقعات اکبر** : یہ ابوالفضل کی فارسی کتاب 'اکبر نامہ' کا ترجمہ ہے جو لارڈ منٹو کے عہد میں تحریر کیا گیا (۱۸۰۹ء)۔ اس میں عظیم مغل حکمراں جلال الدین محمد اکبر کی حیات و واقعات کو پیش کیا گیا ہے۔ اشک کو اس کتاب کے ترجمے پر دوسو روپے ملے تھے۔

۶- **منتخب الفوائد** : یہ کتاب ۱۲۲۶ھ (۱۸۱۱ء) میں مکمل ہوئی تھی۔ دراصل یہ محمد منصور ابوالفرح خلیل کی فارسی تصنیف کا ترجمہ ہے۔ اس میں ۳۴ ابواب ہیں جو پند و نصائح سے بھرپور ہیں۔ پہلا باب بادشاہوں کے کرم و حلم اور عفو سے متعلق ہے۔ بعد کے ابواب میں بھی بادشاہت سے متعلق باتیں بتائی گئی ہیں۔ اسکا قلمی نسخہ ایشیاٹک سوسائٹی آف بنگال میں موجود ہے۔ دیباچہ میں ہی اشک کی شاعرانہ خوبیوں کا اندازہ ہوجاتا ہے۔ لکھتے ہیں :

کہاں ہے تاب وطاقت یہ زباں کی — کہے جو حمد خلاقِ جہاں کی
کرے ہے چشم جیدھر کو نظارہ — ہے اس صانع کی قدرت کا نظارہ
اسی نے خاک کو یہ خوبیاں دیں — ہر ایک مخلوق پر محبوبیاں دیں[۲]

مندرجہ بالا تصانیف کا اسلوب اشک کی قادرالکلامی اور علمی استعداد کی گواہی دیتا ہے۔

امانت اللہ شیدا

امانت اللہ شیدا کے بارے میں بینی نرائن جہاں 'دیوانِ جہاں' میں بس اتنا ہی لکھتے ہیں کہ شیدا تخلص۔ نام مولوی امانت اللہ۔ کلکتے میں تشریف رکھتے تھے۔ بیان سے ہے :

تیری گلی میں آگے بہت رو کے ہم چلے — اور ہاتھ تیرے وصل سے اب دھو کے ہم چلے

۱- قلمی نسخہ منتخب الفوائد، ایشیاٹک سوسائٹی آف بنگال

آئے تھے کچھ کمانے کو بازارِ عشق میں — پر نقدِ دل ہی اپنا عبث کھو کے ہم چلے

مندرجہ بالا بیان کی روشنی میں ہم کہہ سکتے ہیں کہ جب ۱۸۱۲ء میں بینی نرائن کی کتاب 'دیوانِ جہاں' تصنیف کے مراحل سے گذر رہی تھی تو اس وقت شیدا کلکتے میں نہیں تھے۔ یا تو وہ کلکتہ چھوڑ چکے تھے یا اس دنیا سے گذر چکے تھے۔

جاوید نہال کے مطابق وہ ۱۸۱۶ء تک کالج سے وابستہ تھے اور ۱۲۶۲ھ میں انکا انتقال غالباً کلکتے میں ہوا (انیسویں صدی میں بنگال کا اردو ادب، صفحہ: ۳۱۳)۔ یہی بات کم و بیش ڈاکٹر سمیع اللہ کی کتاب فورٹ ولیم کالج میں نظر آتی ہے۔ وہ لکھتے ہیں :

''گلکرسٹ کے زمانے میں شعبۂ ہندوستانی سے وابستہ ہوئے اور ۱۸۱۲ء تک مترجم کے عہدے پر برقرار رہے۔ ۱۲۶۱ء (۴۶-۱۸۴۵ء) میں کلکتہ ہی میں ان کا انتقال ہوا'' (فورٹ ولیم کالج: ایک مطالعہ، صفحہ: ۱۴۹)

تاہم ان دونوں حضرات نے یہ باتیں بغیر کسی حوالے کے کہی ہیں۔

عبیدہ بیگم 'دیوانِ جہاں' سے حوالہ تو دیتی ہیں تاہم غلط بیانی سے کام لیتی ہیں مثلاً ان کا کہنا ہے کہ بینی نرائن نے دیوانِ جہاں میں لکھا ہے کہ 'امانت اللہ کلکتے میں رہتے ہیں' اور اس لئے وہ امانت اللہ کے اس وقت کلکتے میں ہونے یا بقیدِ حیات ہونے کو فرض کر لیتی ہیں۔ جبکہ بینی نرائن نے ماضی کا صیغہ استعمال کیا اور لکھا ہے کہ کلکتے میں تشریف رکھتے' تھے'۔ اس بنا پر ہم کہہ سکتے ہیں کہ اس وقت تک شیدا یا تو کلکتہ چھوڑ چکے تھے یا دنیا۔ شیدا اپنی درج ذیل تصانیف کے لئے مشہور ہیں۔

۱- **ھدایت الاسلام** : امانت اللہ نے پہلے یہ کتاب عربی میں لکھی تھی، پھر اردو میں پیش کیا۔ اس کی دو جلدیں ہیں۔ پہلی جلد ہندوستانی پریس کلکتہ سے ۱۸۰۴ء میں شائع ہوئی۔ دوسری جلد شائع نہیں ہوسکی تھی۔

انالس آف دی کالج آف فورٹ ولیم میں ہدایت الاسلام کو Prayers کے ذیل میں رکھا گیا ہے اور لکھا ہے :

ہدایت الاسلام -1804- in two volumes. The 2nd volume has not been printed.

اس میں احکامِ شرعی مثلاً چار کلمے، وصفِ ایمان اور نمازوں کی نیت وغیرہ کو اردو میں لکھا ہے۔

۲- **جامع الاخلاق** : لوامع الاشراق فی مکارم الاخلاق' عرف اخلاقِ جلالی کا ترجمہ اور تلخیص ہے۔ یہ عربی کے مشہور و معروف عالم مولانا جلال الدین محقق دوانی کی تصنیف ہے۔ مولوی امانت اللہ نے کپتان جیمس موئٹ کے کہنے پر اسے ترجمہ کیا تھا۔ یہ کتاب ۱۲۲۰ھ مطابق ۱۸۰۵ء میں مکمل ہوئی تاہم تب شائع نہیں ہوسکی تھی۔ غلام حیدر، ساکن ہوگلی نے اسے پہلی بار ۱۸۴۸ء میں مطبعِ محمدی سے چھاپا۔

ابتدا میں شیدا نے انگریز حاکموں کی تعریف میں کچھ اس طرح زمین آسمان کے قلابے ملائے ہیں کہ ٹیپو سلطان جیسے تحریکِ آزادی کے سپاہی تک کو کمتر ثابت کر دیا ہے۔ نثر کے ساتھ ساتھ شعری صلاحیت کا بھی مظاہرہ کرتے ہوئے کہتے ہیں :

کسی نے اگر اس سے دعویٰ کیا پھر آخر کو خود وہ پشیماں ہوا
بھلا اس کے کہنے کی کیا احتیاج خدا جس کو چاہے اسی کا ہے راج
یہ درگاہِ حق جو کہ مقبول ہے سبھی سامنے اس کے معقول ہے

۳- **صرف اردو** : یہ ایک منظوم رسالہ ہے جو ۱۸۰۶ء میں مکمل ہوا۔ اس میں شیدا نے صرف ونحو کے قاعدے بتائے ہیں۔ یہ ہندوستانی پریس سے ۱۸۱۰ء میں شائع ہوا۔ انالس آف دی فورٹ ولیم کالج میں اس کا ذکر ملتا ہے۔

اسکے علاوہ نقلیاتِ لقمانی کے لئے کئے گئے ترجموں میں بھی انہوں نے ہاتھ بٹایا تھا۔

للو جی لال کب

للو جی لال گجراتی برہمن تھے لیکن آگرے میں بود وباش تھی۔ بقول رام چندر شکل :

''ان کا جنم سمبت ۱۸۲۰ میں اور مرتیو سمبت ۱۸۸۲ میں ہوئی۔''[۱]

فورٹ ولیم کالج کے ہندوستانی شعبے میں ان کی تقرری ۱۸۰۲ء میں ہوئی۔ وہ اگست ۱۸۰۱ء سے سرٹیفکٹ منشی کی حیثیت سے کام کر رہے تھے۔ وارشنے نے ۱۸۰۲ء سے ان کی ملازمت کے مستقل ہونے کی بات کہی ہے۔ للو جی لال مئی ۱۸۲۳ء تک کالج سے وابستہ رہے۔ کالج کاروائی کے حوالے سے وارشنے کا کہنا ہے کہ :

۱- ہندی ساہتیہ کا اتہاس۔ رام چندر شکل۔ ناگری پرچارنی سبھا کاشی۔ سمبت ۲۰۳۵ وکرم صفحہ: ۴۸۹

''مئی ۱۸۲۲ء کی کالج کاروائی لگ بھگ پہلے والی کاروائی کے مطابق ہے۔ شعبے میں صرف للولال جی کا ذکر ہے۔ دوسرے کسی کا نہیں۔ یکم مئی ۱۸۲۳ء کو ان کا ذکر آخری بار آتا ہے۔ غالباً یکم مئی ۱۸۲۴ء سے قبل ان کا انتقال ہوگیا تھا۔ اگر وہ ریٹائر کئے ہوتے تو انہیں پنشن ملتا۔ للولال جی کے بعد کالج کو برج بھاشا کا ایک استاد چاہئے تھا۔ کیری نے سیرام پور میشنری سے گنگا پرشاد شکل کو بھیجا۔ جن کا سنسکرت اور ہندی بولی میں امتحان لینے کے بعد پرائس نے مطمئن ہوکر ۲۳ ستمبر ۱۸۲۳ء کو کونسل کو ان کی تقرری کے لئے سفارش بھیجی۔''[۱]

للو جی لال کے بارے میں رام چندر شکل کا قیاس ہے کہ :

''انہوں نے انشاءاللہ خان کی بھلے ہی ٹھیٹھ ہندی میں لکھنے کی قسم نہ کھائی ہو لیکن غیر ملکی لفظوں کو داخل نہ ہونے دینا ان کا ایک مقصد ضرور رہا تھا۔ اگر یہ اردو نہ جانتے ہوتے تو ان کیلئے عربی فارسی الفاظ کو روکنا اور بھی مشکل ہوتا کیونکہ عربی اور فارسی کے الفاظ اس طرح بول چال کی زبان میں گھل مل گئے تھے کہ ان کو پہچاننا بھی مشکل تھا.... للولال جی انجان میں کہیں کہیں ایسے شبد لکھ گئے ہیں جو فارسی یا ترکی کے ہیں۔''[۲]

للو جی لال کی تصانیف درج ذیل ہیں :

۱- **لطائف ہندی** : اس میں چھوٹی چھوٹی حکایتیں ہیں۔ یہ ۱۸۱۰ء میں فارسی اور دیوناگری رسم الخط میں ایک ساتھ شائع ہوئی۔ یہ دراصل اردو اور ہندی کو الگ زبانوں کے طور پر پیش کرنے کی ایک کوشش ہے۔

اس میں شامل حکایتیں طنز و مزاح کا نمونہ ہیں۔ سماج کے سربرآوردہ لوگوں کو خاصہ نشانہ بنایا گیا اور مختصر نقلوں کے ذریعہ انکی کمیوں اور خامیوں کو واضح کیا گیا ہے۔ اخیر میں الفاظ کی فرہنگ بھی ہے تا کہ انگریز طالبعلموں کو ان لفظوں کے معنی سمجھنے میں آسانی ہو سکے جو ان حکایتوں میں پیش آئے ہیں۔

۲- **برج بھاشا کے قواعد** : گلکرسٹ کو زبان کے قاعدے کی اہمیت کا اندازہ

۱- فورٹ ولیم کالج لکشمی ساگر وارشنے۔ الہ آباد یونیورسٹی، سمبت ۲۰۰۴، ص: ۹۷

۲- ہندی ساہتیہ کا اتہاس۔ رام چندر شکل۔ ناگری پرچارنی سبھا کاشی۔ سمبت ۲۰۳۵ وکرم صفحہ: ۴۸۹

تھا، اس لئے اس نے نہ صرف خود قاعدے لکھے بلکہ دوسروں کو بھی اس کام پر راضی کیا۔ للوجی لال کی یہ کتاب ۱۸۱۱ء میں شائع ہوئی تھی۔

۳- **پریم ساگر** : یہ بھگوت گیتا کے دسویں باب (دسم اسکند) کا ترجمہ ہے۔ کتاب کے سرورق پر صاف لکھا ہے کہ چونکہ ہندوؤں کی ایک بڑی تعداد فارسی رسم الخط سے واقف ہے اس لئے انکی سہولت کیلئے پریم ساگر کو دیوناگری رسم الخط میں لکھنے کے بعد فارسی میں بھی لکھا جا رہا ہے۔

> ''پریم ساگر۔ جس کو سری للولال جی کب برہمن گجراتی سہسر اودیچ آگرہ والے نے سری مد بھاگوت دسم اسکند کا دہلی آگرہ کی کھڑی بولی اور برج بھاکھا شامل کر کے ترجمہ کیا، اس کو حسب الایمائے منشی نول کشور صاحب واسطے فارسی پڑھے ہوئے بھگت جنوں کے صحتِ لفظی وتلفظِ صحیح وبعض حاجل لغاتِ بھاکا کے ساتھ لالہ سوامی دیال صاحب نے بڑے غور سے ترجمہ کیا۔''[1]

پنڈت چتر بھوج مسر نے اسے سنسکرت سے برج میں کیا تھا۔ للوجی لال نے برج سے اردو ہندی میں کیا۔ ۹/ اگست ۱۸۰۳ء کو گلکرسٹ نے کالج کونسل کے سامنے کتابوں کی جو فہرست انعام کی سفارش کے ساتھ پیش کی اس میں پریم ساگر (دیوناگری) کو زیرِ طبع بتایا گیا ہے۔[2]

'پریم ساگر' کے علاوہ راج نیتی، سبھا بلاس، لال چندریکا وغیرہ بھی للوجی لال کی تصانیف میں شمار ہوتی ہیں لیکن ان کے نسخے دستیاب نہ ہونے کی صورت میں تفصیلی بحث ممکن نہیں۔ جاوید نہال نے 'بدیا درپن' بھی ان سے منسوب کیا ہے لیکن عبیدہ بیگم، شاردا دیوی کے حوالے سے لکھتی ہیں کہ للوجی لال نے 'اودھ بلاس' نامی کتاب لکھی تھی۔ مرزائی بیگ نے 'اودھ بلاس' کا ترجمہ 'بدیا درپن' کے نام سے کیا تھا۔

'انالس آف دی کالج آف فورٹ ولیم' کے مطابق انہوں نے شکنتلا، سنگھاسن بتیسی اور بیتال پچیسی کے ترجمے میں مرزا کاظم علی جوان، اور 'مادھونل' میں مظہر علی خاں ولا، کی معاونت کی تھی نیز 'لطائفِ ہندی' کا ہندوستانی اور دیوناگری نسخہ تیار کیا تھا۔ (صفحہ:۲۶)

للوجی لال سے دیوناگری رسم الخط میں کئی کتابیں لکھوائی گئیں۔ ان میں سنسکرت کے الفاظ

۱- پریم ساگر (سرورق)، مطبع نول کشور، ۱۸۶۳ء

۲- گلکرسٹ اور اس کا عہد، محمد عتیق صدیقی، صفحہ:۱۶۲

شامل کر کے اردو سے الگ زبان قرار دینے کی سازش کی گئی۔ F.E.Keay اسے 'ہائی ہندی' کا نام دیتا ہے۔ لکھتا ہے :

> The Hindi of Lallu Ji Lal was really a new literary dialect. This 'High Hindi' or 'standard Hindi' as it is also called, has had however a great success. It has been adopted as the literary speech of millions in North India. (1)

رام چندر شکل نے سنگھاسن بتیسی، بیتال پچیسی، شکنتلا ناٹک، مادھونل اور پریم ساگر کو للوجی لال کی تصانیف بتایا ہے۔ وہ کہیں بھی مظہر علی خاں ولا یا کاظم علی جوان کا ذکر نہیں کرتے شاید وہ ان تصانیف کے سلسلے میں ان کی خدمات سے انجان ہوں گے جبھی لکھتے ہیں کہ :

> ''پریم ساگر کے پہلے کی چاروں پستکیں بالکل اردو میں ہیں۔''[2]

للولال کی دوسری تصانیف کے بارے میں فرماتے ہیں کہ :

> ''سمبت ۱۸۳۶ میں راج نیتی کے نام سے ہتوپدیش کی کہانیاں برج (نثر) میں لکھیں۔ 'مادھو ولاس' اور 'سبھا ولاس' نام سے برج میں شعری کاوشیں بھی انہی کی ہیں۔ ان کی لال چندریکا نام کی بہاری ست سئی کی ٹیکا بھی مشہور ہے۔''[3]

ان کے آخری دنوں کے بارے میں فرماتے ہیں کہ :

> ''انہوں نے اپنا ذاتی پریس بھی کلکتے میں پٹل ڈانگا میں کھولا تھا۔ سمبت ۱۸۸۱ میں فورٹ ولیم کالج سے پنشن ملنے کے بعد اسے آگرے لیتے گئے۔ آگرے میں پریس جما کر یہ ایک بار پھر کلکتے گئے۔ جہاں ان کی موت واقع ہو گئی۔ ان کے پریس کا نام سنسکرت پریس تھا۔''[4]

للولال جی نے کھڑی کا خوب استعمال کیا ہے۔ رام چندر شکل، للولال جی کی کھڑی بولی میں برج کا رنگ دیکھتے ہیں، اس لئے کہتے ہیں کہ :

۱- A History of Hindi Literature, F.E.Keay, Association Press, Calcutta, 1920, P. 87

۲- ہندی ساہتیہ کا اتہاس۔ رام چندر شکل۔ ناگری پرچارنی سبھا، کاشی۔ سمبت ۲۰۳۵ وکرم، صفحہ:۴۸۸

۳- ایضاً صفحہ:۴۸۸   ۴- ایضاً صفحہ:۴۸۸

''للوجی لال کی کھڑی بولی 'برج رنجت' (برج میں رنگی) ہے۔''

مولوی اکرام علی

مولوی اکرام علی کے آباواجداد کابل کے رہنے والے تھے۔ بقول نادم سیتاپوری ان کا سلسلۂ نسب حضرت عمر فاروق سے ملتا ہے۔ ان کے بزرگوں میں کوئی شیخ محمد رئیس سیتاپور آکر آباد ہو گئے تھے۔ اکرام علی کے والد شیخ احسان علی کی پیدائش سیتاپور میں ہی ہوئی تھی۔ ان کا گھرانہ صوفیوں کا گھرانہ تھا۔ ان کی ولادت ۷۵-۱۷۷۴ء کے درمیان ہوئی تھی (عبیدہ بیگم کا قیاس ہے کہ ۸۳-۱۷۸۲ء)۔ ابتدائی تعلیم ان کے والدِ بزرگوار کے ذریعہ حاصل ہوئی۔ والد کے مفقودالخبر ہو جانے کے بعد چچا شیخ مردان علی نے دیکھ بھال کی۔ انہی کے ساتھ اکرام علی دلی بھی گئے تھے۔ بعد ازاں سیتاپور واپس چلے آئے۔ اس کے بعد لکھنو گئے۔ کلکتہ آئے تو اپنے بھائی تراب علی نامی کے پاس ٹھہرے۔ اکرام علی نے شاعری میں اصلاح بھی انہی سے لی تھی۔ نامی کے مدراس جانے کے بعد اکرام علی لاکٹ کے منشی مقرر ہوئے۔ ۱۸۱۶ء میں کالج لائبریرین کے عہدے پر فائز ہوئے۔ (بحوالہ اانالس آف دی کالج آف فورٹ ولیم)۔ نادم سیتاپوری کے مطابق آپ کی نوکری ختم ہونے کے بعد آپ کلکتہ کے صدر الصدور بنائے گئے تھے۔ لیکن بہت جلد آپ ان مصروفیات سے کنارہ کرکے سیتاپور واپس چلے گئے۔ وہاں آپ نے ۱۸۳۷ء میں ایک جامع مسجد بنوائی تھی جو آج بھی موجود ہے۔ جب اجمیر میں دارالافتاء قائم ہوا تو آپ پہلے مفتی مقرر ہوئے۔ اس وقت آپ کی تنخواہ تین سو روپے ماہوار تھی۔ اجمیر میں آپ طبابت بھی کرنے لگے۔ آپ کے والد بزرگوار آپ کی شہرت کی خبر سن کر آپ سے ملنے کے متمنی ہوئے لیکن انکے متمنی بیٹے نے انہیں زہر دے کر مار ڈالا۔

اکرام علی کو اس کا شدید صدمہ پہنچا۔ کچھ دنوں بعد آپ بھی اس دارِ فانی سے کوچ کر گئے۔ اجمیر میں ہی آپکی تدفین ہوئی۔ نادم سیتاپوری نے آپ کا سالِ وفات ۳۸-۱۸۳۷ء بتایا ہے۔[1]

آپ کی ایک ہی تصنیف کا پتہ چلتا ہے جو درج ذیل ہے۔

۱- **اخوان الصفا**: اخوان الصفا عربی زبان کی تصنیف ہے جو اکیاون رسائل پر مشتمل ہے۔ یہ چوتھی صدی ہجری کے نصف آخر میں تحریر کی گئی تھی۔ یہ اسماعیلی فرقے کے عالموں کا تحریر کردہ ہے۔ اکرام علی نے کپتان جان ٹیلر کے حکم سے فارسی سے اس حصے کا ترجمہ کیا ہے جو

انسانوں اور جانوروں کے مناظرے میں ہے۔ اسے مولوی غلام حیدر ساکن ہوگلی نے چھاپا تھا۔ بعد ازاں مولوی اکرام احمد ضیغم صاحب نے تصحیح کی اور مطبع محمدی، مچھوا بازار، کلکتہ سے ۱۸۵۲ء مطابق ۱۲۶۸ھ شائع کیا۔

حمد و نعت کے بعد مولوی اکرام علی مترجم 'اخوان الصفا' مسٹر ابراہیم لاکٹ، مولوی تراب علی اور ولیم ٹیلر کا ذکرِ خیر کرتے ہیں۔ دیباچے سے یہ بھی پتہ چلتا ہے کہ یہ نرا ترجمہ نہیں بلکہ اکرام علی نے اپنے تبحرِ علمی سے کام لیتے ہوئے اس میں خاصہ تصرف کیا ہے۔ لکھتے ہیں :

> ''مدرسِ ہندی کپتان جان ولیم ٹیلر بہادر دام دولتہ نے فرمایا کہ رسالہ اخوان الصفا کہ انسان و بہائم کے مناظرے میں ہے، تو اس کا زبانِ اردو میں ترجمہ کر لیکن نہایت سلیس کہ الفاظ مغلق اس میں نہ ہوویں بلکہ اصطلاحاتِ علمی اور خطبے بھی اسکے تکلف سے خالی نہیں، قلم انداز کر۔ صرف خلاصہ مضمون مناظرے کا چاہئے۔ راقم نے بموجب فرمانے کے فقط حاصلِ مطلب کو محاورۂ اردو میں لکھا۔''[1]

یہ ترجمہ لارڈ منٹو کے عہد میں ۱۸۱۰ء میں مرتب ہوا۔ چونکہ کتاب کے سرورق پر لکھا ہے کہ 'فورٹ ولیم کالج کے اردو سیکھنے والے صاحبوں کے لئے اور اس کے بغیر پڑھے امتحان کسی کا پورا نہیں ہوتا'، اس لئے اس کتاب کا فورٹ ولیم کالج کے نصاب میں شامل ہونے کا پتہ چلتا ہے۔

مولوی شیخ حفیظ الدین احمد

مولوی حفیظ الدین کے والد کا نام شیخ ہلال الدین اور دادا کا نام محمد ذاکر تھا۔ ان کی زندگی کے حالات اس دیباچے سے ملتے ہیں جو انہوں نے اپنی مشہور زمانہ تصنیف 'خرد افروز' میں درج کئے ہیں۔ لکھتے ہیں :

> ''بعد حمد و نعت کے شیخ حفیظ الدین احمد بن شیخ ہلال الدین محمد بن شیخ محمد ذاکر صدیقی کہتا ہے کہ اس فقیر کے جد پہلے عرب سے دکھن کو آئے۔ بعد دو تین پشتوں کے شیخ مرحوم و مغفور جنت البلاد بنگالے کو تشریف لائے۔ ان کے عہد سے پانچ پشت تلک توکل و عبادت میں گذری۔ چنانچہ ان کی اولاد سے شیخ

۱- دیباچہ اخوان الصفا، اکرام علی، مطبع محمدی، مچھوا بازار، کلکتہ ۱۸۵۲ء

سعدی عرف شاہ پران قدس سرہٗ نے حضرت شاہ عنایت اللہ علیہ الرحمتہ کی خدمت میں جو حضرت شاہ عبداللہ کرمانی رحمت اللہ علیہ کی اولاد سے تھے، نعمتیں حاصل کیں اور ان سے تلقین ہو کر زہد و ریاضت میں حد سے زیادہ کمال کو پہنچے۔ بہ حسب اتفاق حضرت قبلہ گاہی مدظلہ السامی نے پیشہ نوکری کا اختیار کیا۔ اس حقیر نے بیس برس کے سن تک ہیسٹنگز صاحب کے مدرسے میں رہ کر علوم عربی و فارسی سے فراغت کی۔ تب تحصیلِ علم کے بعد فکرِ معیشت میں جو لازم ہے، در آیا اور کمپنی بہادر کے اس مدرسہ عالیہ میں نوکر ہوا۔" [1]

غرض حفیظ الدین کے مدرسہ عالیہ سے تعلیم حاصل کرنے کی بات خرد افروز کے دیباچے سے ہی معلوم ہوتی ہے۔

مولوی عبدالحق اور مؤلف سیر المصنفین کا کہنا ہے کہ فورٹ ولیم کالج سے وابستہ ہونے سے پہلے وہ ریزیڈنٹ دہلی کے منشی تھے۔ لیکن خود حفیظ الدین نے اس طرف اشارہ نہیں کیا ہے۔ فورٹ ولیم کالج سے سبک دوش ہونے کے بعد وہ مسٹر مٹکاف کے منشی مقرر ہوئے تھے، جو اس وقت دہلی میں ریزیڈنٹ تھے۔ کریم الدین نے انہیں ۱۸۱۵ء میں دہلی میں دیکھا تھا۔ ای۔ ایسٹ۔ ویک بھی اس کی تائید کرتے ہیں۔ حفیظ الدین کے متعلق کریم الدین مصنف 'تذکرہ طبقات الشعرائے ہند' کا کہنا ہے کہ شیخ حفیظ الدین شاعر بھی تھے اور احمد تخلص کرتے تھے۔ لیکن کریم الدین نے ان کا کوئی شعر نقل نہیں کیا ہے۔ [2]

۱- **خــرد افــروز** : جاوید نہال قلمی نسخے کے حوالے سے کہتے ہیں کہ حفیظ الدین نے کالج کونسل کا اشتہار پڑھ کر 'عیار دانش' کا ترجمہ اردو میں 'خرد افروز' کے نام سے کیا۔ لکھتے ہیں :

"مولوی حفیظ الدین کا کہنا ہے کہ انہوں نے کالج کونسل کا اشتہار پڑھ کر 'خرد افروز' کا ترجمہ کیا تھا۔ عام خیال ہے کہ پروفیسر جان گلکرسٹ کی فرمائش پر مولوی صاحب نے 'خرد افروز' کو مرتب کیا تھا۔ لیکن 'خرد افروز' کے خطی نسخہ یا مطبوعہ ایڈیشن ۱۸۱۵ء اور ۱۸۴۷ء سے کہیں یہ ظاہر نہیں ہوتا کہ انہوں نے جان گلکرسٹ یا کسی اور شخص کے ایماء پر 'خرد افروز' کا ترجمہ کیا تھا۔" [3]

۱- خرد افروز، حفیظ الدین احمد، مجلس ترقی ادب، لاہور، سال اشاعت ندارد، صفحہ: ۳

۲- طبقات شعرائے ہند۔ کریم الدین، اتر پردیش اردو اکادمی، لکھنؤ۔ ۱۹۸۳۔ صفحہ: ۴۲۵

۳- انیسویں صدی میں بنگال کا اردو ادب، ڈاکٹر جاوید نہال، صفحہ: ۲۰۸

حالانکہ 'خرد افروز' کے مطبوعہ نسخے (مجلس ترقی ادب، لاہور) اور قلمی نسخے (ایشیاٹک سوسائٹی آف بنگال) میں درج ذیل عبارتیں ملتی ہیں :

"ایک دن مدرسِ ہندی جان گلکرسٹ صاحب دولتہ نے فرمایا کہ ترجمہ عیار دانش کا جو فی الحقیقت دانش کی کسوٹی ہے اور آئینِ سلطنت کا دستور العمل ہے، کر۔" (دیباچہ خرد افروز، مرتبہ سیّد عابد علی عابد، صفحہ: ۳)

حفیظ الدین حکم بجالائے اور عیار دانش کا ترجمہ کیا۔ سچ پوچھئے تو دونوں ہی باتیں صحیح ہیں۔ یعنی دیباچے میں حفیظ الدین لکھتے ہیں کہ انہوں نے یہ ترجمہ گلکرسٹ کے حکم پر کیا اور کتاب کے خاتمے پر لکھتے ہیں کہ :

"صاحبانِ عالیشان نجیبوں کے قدر (د) اس کو خدا سلامت رکھے۔ فدوی نے حکم اشتہار سن کر عیار دانش کو کہ فی الحقیقت جواہر بے بہا ہے اور اب تک جواہر خانۂ فارسی میں مقفل تھی، کلیدِ کوشش سے کھول کر زبانِ ریختہ میں آب و تاب دے کر اردوئے معلی میں جلوہ گر کی۔" [1]

ہوسکتا ہے کہ اشتہار پڑھ کر وہ گلکرسٹ کے پاس پہنچے ہوں گے اور گلکرسٹ نے یہ کام انہیں سونپ دیا ہوگا۔ اگر نہال صاحب نے پورا دیباچہ پڑھا ہوتا تو یہ غلط فہمی نہ ہوئی ہوتی۔

اس نسخے میں کل اوراق ۳۸۹ ہیں۔ آخری دو صفحات میں حفیظ الدین نے کتاب کے مکمل ہونے پر خدا کا شکر ادا کیا۔ انکی باتوں سے پتہ چلتا ہے کہ کتاب ۱۸۰۳ء میں مکمل ہوئی تھی۔ لکھتے ہیں:

"شکر خدا کا (کہ) یہ کتاب خرد افروز جو آدابِ سلطنت کے واسطے دستور العمل، تاجِ سعادت کیلئے دریکتا، بازوئے دانش کی تعویذ، لڑکوں کی بازی، بوڑھوں کی موجب سرفرازی ہے ۱۲۱۷ھ شہر ذی الحج کی دسویں تاریخ روز یکشنبہ موافق تاریخ ۱۸۰۳ء مطابق تاریخ بائیسویں ماہ چیت ۱۲۰۹ بنگلہ میں حسنِ انصرام کو پہنچی"۔ [2]

یہ کتاب ہندستان میں رائے داشلیم (جو ہندوستان کی کسی سرحد کا حاکم تھا) کے عہد میں حکیم بید پائے برہمن نے تصنیف کی تھی۔ اس کتاب میں اگلے داناؤں کی نصیحتیں بطور افسانوں کے

۱- دیباچہ۔ خرد افروز۔ قلمی نسخہ۔ ایشیاٹک سوسائٹی۔ ۲- قلمی نسخہ۔ خرد افروز

بے زبانوں کی زبان سے ادا کروائی گئی ہیں۔ نوشیرواں عادل نے بزرویہ یا پزرویہ طبیب کو اس کی تلاش میں ہندوستان بھیجا تھا۔ نوشیرواں کی خاطر اسے پہلوی زبان میں ترجمہ کیا گیا۔ اس کے بعد دنیا کی بہت ساری زبانوں میں اس کے ترجمے شائع ہوئے۔ بقول حفیظ الدین :

> ''پزرویہ طبیب نے نوشیرواں عادل کے حکم سے ہندوستان میں آ کر کتاب 'کرتک دمنک' کو زبانِ پہلوی میں ترجمہ کر کے وادیٔ طلب کے پیاسوں کو سیراب کیا تھا۔ بعد اس کے ابو منصور دوانقی کے وقت میں جب ابوالحسن عبدالمقفع نے اس پردہ نشین شبستانِ فکر کے تئیں لباسِ عربی پہنایا۔ عرب بھی اس کی جمالِ جہاں آرا کو دیکھ کر حیراں ہوئے۔ پھر سلطان محمود غزنوی کی حسب فرمائش ابوالمعالی نصر اللہ مستوفی نے اسے زیور فارسی سے آراستہ کیا۔ لیکن نقاب استعارات عرب کے اسکے چہرے پر اس طرح ڈالے کہ دیدار کے طالب جمالِ مقصود کے نہ دیکھنے سے گھبرائے۔ اس واسطے امیر شیخم سہیلی کے حکم سے مولانا حسین واعظ نے ان پردوں کو اٹھایا لیکن اس نے آپ نئے سر (سرے سے؟) ایسے نقاب ڈالے کہ مشتاقوں کے ملال کا موجب ہوا۔ پھر اگرچہ ابوالفتح جلال الدین محمد اکبر بادشاہ غازی کے حسب الحکم ابوالفضل بن مبارک نے ان نقابوں کو بالکل اٹھا کر اس کے حسنِ عالم افروز کو جلوہ گر کیا پر صورتِ ہندی کو لباسِ ہندی ہی پھبتا ہے۔'' (قلمی نسخہ خرد افروز۔ صفحہ: ۳۸۷)

حفیظ الدین کی کتاب 'خرد افروز' میں سولہ ابواب ہیں۔ ہر باب میں دانشمندی کی باتیں بتائی گئی ہیں۔

اس کتاب کے کچھ حصے پہلے پہل گلکرسٹ کی کتاب بیاضِ ہندی میں چھپے۔ پوری کتاب ۱۸۰۵ء میں شائع ہوئی۔ اس کے بعد تھامس روبک نے کاظم علی جواں، غلام اکبر، مرزائی بیگ اور منشی غلام قادر کی نظرثانی کے بعد ۱۸۱۵ء میں چھاپی۔ تیسرا ایڈیشن ای۔ ویسٹ۔ ویک نے ۱۸۵۷ء میں انگلستان سے طبع کروایا۔

لالہ کاشی راج

بقول کاشی ساگر وارشنے، لالہ کاشی راج لاہور کے رہنے والے تھے۔ وہ فورٹ ولیم کالج کے شعبۂ ہندی سے متعلق تھے۔ کالج میں ان کا تقرر ۴؍مئی ۱۸۰۱ء کو ہوا تھا۔ (بحوالہ فورٹ ولیم کالج، صفحہ ۲۲) بعد ازاں شعبۂ پنجابی سے متعلق ہو گئے تھے۔

ان کی ایک ہی تصنیف کا پتہ چلتا ہے اور وہ ہے 'پنجابی لغت'۔ اس کے علاوہ انہوں نے 'گلستاں' اور 'ہندی اسٹوری ٹیلز' کو پنجابی میں منتقل کیا تھا۔ 'ہندی اسٹوری ٹیلز' کے ترجمے پر انہیں ایک سو روپے کا انعام ملا تھا۔

منصور علی

منصور علی کا تقرر فورٹ ولیم کالج میں میر بہادر علی حسینی کی سفارش پر فروری ۱۸۰۲ء میں ہوا۔ ان کی ایک ہی تصنیف 'بحر عشق' کا پتہ چلتا ہے جس کا قلمی نسخہ ایشیاٹک سوسائٹی آف بنگال، کلکتہ کی لائبریری میں موجود ہے۔ اس قلمی نسخے کے دیباچے سے جن حقیقتوں کا علم ہوتا ہے، وہ یہ ہیں :

۱۔ منصور علی کے والد کا نام امام بخش حسینی سبزواری تھا۔

۲۔ انہوں نے 'بحرِ عشق' کو ۱۸۰۳ء میں گلکرسٹ کے کہنے پر ریختہ میں لکھا۔

۱۔ **بحر عشق** : یہ 'سیف الملوک و بدیع الجمال' کا ترجمہ ہے۔ اس میں عام داستانوں کی طرح مافوق الفطری واقعات بیان ہوئے ہیں۔ نسخہ کل ۲۵۶ صفحات پر مبنی ہے۔ منصور علی نے قصے کے بیچ بیچ میں اشعار لکھ کر اپنی شاعرانہ صلاحیت کا اظہار کیا ہے۔ ستمبر ۱۸۰۵ء تک کالج میں انکی موجودگی کا پتہ چلتا ہے۔ (وارشنے، فورٹ ولیم کالج، صفحہ: ۷۹)

مرزا محمد فطرت

بقول عتیق صدیقی، فطرت کی تقرری کول بروک کی سفارش پر ۷؍نومبر ۱۸۰۳ء کو فورٹ ولیم کالج میں اسی روپے ماہوار پر ہوئی تھی۔ انہوں نے انجیل کے فارسی و ہندوستانی ترجمے کا کام کیا تھا۔ وارشنے کے مطابق انہیں اس پر پانچ سو روپے، بطور انعام دئے گئے تھے۔

میر بخشش علی

میر بخشش علی، فیض آباد کے رہنے والے تھے۔ فورٹ ولیم کالج میں ان کی تقرری بہ حیثیت

منشی ۱۸۰۳ء میں ہوئی تھی۔ امتحان پاس کرنے کے بعد سکنڈ منشی ہوئے تو سو روپے تنخواہ پانے لگے تھے۔ انہوں نے لگ بھگ ۲۷ سال ملازمت کی۔ رڈل نے پنشن پانے والے ہندوستانی منشیوں کا حلیہ جب انکے پروفیسروں سے مانگا تا کہ اکاؤنٹنٹ جنرل سی۔ مارٹے اور نائب خزانچی جے۔ آر۔ باروئل کو بھیجا جا سکے تو پرائس نے اپنے شعبوں کے تین منشیوں کا حلیہ لکھ بھیجا تھا جن میں سے ایک بخشش علی بھی تھے۔ پرائس نے ان کا حلیہ کچھ یوں بتایا تھا :

> ''میر بخشش علی۔ پچاس روپیہ پنشن۔ عمر اڑتالیس سال۔ بیچ کا قد۔ رنگ کچھ گورا۔ دائیں گال پر ایک چیچک کا سا داغ ہے۔'' (فورٹ ولیم کالج، وارشنے)

۲۱ مئی ۱۸۳۰ء کو رڈل نے سرکاری فیصلے کی خبر ایچ۔ ٹی۔ پرنسپ کو دے دی۔ (وارشنے، فورٹ ولیم کالج، صفحہ: ۱۳۷)۔ اس اعتبار سے قیاس کیا جا سکتا ہے کہ میر بخشش علی ۱۷۸۲ء میں پیدا ہوئے ہوں گے۔

میر بخشش علی نے زندگی کے آخری ایام کہاں گذارے، اس بارے میں کچھ پتہ نہیں چلتا۔

۱- **اقبال نامہ** : میر بخشش علی کی تصنیف 'اقبال نامہ' منشی غلام حسین کی فارسی تصنیف 'سیر المتاخرین' کے صرف ایک حصے کا ترجمہ ہے۔ بخشش علی نے اسے اس وقت تیار کیا تھا جب ولیم ٹیلر شعبۂ اردو کے پروفیسر تھے (۱۸۰۹ء)۔ یہ قلمی نسخہ ایشیاٹک سوسائٹی آف بنگال کے کتب خانے میں موجود ہے۔ دیباچے میں لکھتے ہیں :

> ''معلوم ہو کہ سید بخشش علی فیض آبادی نے ترجمۂ 'سیر المتاخرین' کا جس میں صاحبانِ عالیشان کی ابتدائے ریاست و شجاعت و عدالت کا بیان مفصل لکھا ہے۔ مدرسانِ ہندی جناب ٹیلر صاحب بہادر اور جناب مارٹن صاحب بہادر دام ظلہما کی فرمائش بموجب جنکے سایۂ دولت میں بسا شرفاء و نجباء آرام و راحت سے استراحت کرتے ہیں، متعلمانِ کالج کے واسطے لکھا۔''[1]

اس میں سرنامے سرخ روشنائی میں لکھے گئے ہیں۔ پہلا بیان سراج الدولہ کے جلوس اور مسندِ حکومت پر بیٹھنے کا ہے۔

۱- دیباچہ، قلمی نسخہ، اقبال نامہ۔ ایشیاٹک سوسائٹی آف بنگال۔

سدل مسر پنڈت

بقول عتیق صدیقی، سدل مسر پنڈت کی تقرری فورٹ ولیم کالج میں ۲۵ر نومبر ۱۸۰۲ء کو ہوئی۔ اس وقت آپ ماتحت منشی تھے اس لئے آپ کی تنخواہ تیس روپے ماہوار تھی۔ جیمس موئٹ نے اپنے خط مورخہ ۹ر مئی ۱۸۰۴ء میں للوجی لال اور سدل مسر کو زائد قرار دیکر شعبۂ ہندی سے برخاست کرنے کی اپیل کی تھی۔ ۱۱ر جون ۱۸۰۴ء کو آپ دونوں برطرف بھی کر دیئے گئے تھے تاہم ۱۴ر اکتوبر ۱۸۰۴ء کو پھر بحال کر دیئے گئے کیونکہ شعبۂ ہندی میں بھاکا منشیوں کی ضرورت تھی۔

سدل مسر کی تصانیف حسب ذیل ہیں۔

۱- **چندراوتی** : سنسکرت کتاب 'ناسکیتا پاکھیان' کا ہندی ترجمہ ہے جو ۱۸۰۳ء میں مکمل ہوا۔ ۹ر اگست ۱۸۰۳ء کو گلکرسٹ نے انعام کی سفارش کے ساتھ جن کتابوں کی فہرست بھیجی تھی ان میں چندراوتی (ناگری) بھی شامل تھی۔ (گلکرسٹ اور اسکا عہد، صفحہ: ۱۷۲)

۲- **رام چرت** : یہ ادھیاتم رامائن کا ترجمہ ہے۔ بقول وارشنے، اس کتاب پر انہیں ۳۰۰ روپے انعام ملے تھے۔ (فورٹ ولیم کالج، صفحہ: ۷۵) سدل مسر نقلیاتِ لقمانی کے ترجمے میں بھی شامل تھے۔ سدل مسر کا انتقال کب اور کہاں ہوا، اسکے متعلق تفصیلات فراہم نہیں ہوتی سدل مسر اور للوجی لال کے اسلوب کا فرق بتاتے ہوئے رام چندر شکل کہتے ہیں کہ :

> ''دونوں کی زبان میں بڑا فرق ہے۔ للولال کی طرح ان کی زبان میں نہ تو برج بھاشا کے تراکیب کی بھرمار ہے اور نہ جگہ بہ جگہ روایتی انداز میں شاعرانہ اسلوب کا استعمال۔ انہوں نے روزمرہ کی زبان ایجاد کی ہے۔ اور جہاں تک ہو سکا ہے کھڑی بولی کا ہی استعمال کیا ہے۔ لیکن ان کی زبان بھی صاف ستھری نہیں ہے۔ برج بھاشا کے تراکیب بھی کہیں کہیں مل جاتے ہیں اور پوربی بولی کے الفاظ کی تو بھرمار ہے۔''[1]

میر معین الدین فیض

میر معین الدین فیض اپنی تصنیف 'چشمۂ فیض' میں اپنے بارے میں جو کچھ لکھتے ہیں اس سے ہم اس نتیجے پر پہنچتے ہیں کہ ان کا پورا نام میر معین الدین فیض ہے، ان کے والد کا نام سید فخر الدین اور

۱- ہندی ساہتیہ کا اتہاس۔ رام چندر شکل۔ ناگری پرچارنی سبھا کاشی۔ سمبت ۲۰۳۵ وکرم صفحہ: ۴۸۹

دادا کا نام سید زین العابدینؔ۔ قوم سادات حسنی الحسینی۔ بزرگوں کا وطن سمرقند ہے۔ ہجرت کر کے ہندوستان آئے اور دہلی میں قیام کیا۔ یہاں حویلیاں بنائیں، ریاست پیدا کی اور محل کا نام بے جبل مسجد یا سید واڑہ رکھا۔ گیارہ پشتیں گذر گئیں۔ دولت و ریاست زوال پذیر ہوئی۔ فیضؔ اپنے لواحقین سمیت غازی پور ضلع بنارس چلے آئے۔

جن دنوں گلکرسٹؔ غازی پور میں قیام پذیر تھا، فیضؔ بھی وہیں تھے اور گلکرسٹؔ کی ملازمت سے لگ گئے تھے۔ عجب نہیں کہ گلکرسٹؔ اسی دوران فیضؔ کی صحبت سے فیض یاب ہوا ہو اور اردو زبان میں لیاقت پیدا کی ہو۔ بعدازاں جب کلکتے میں فورٹ ولیم کالج کھلا تو فیضؔ اس کی شہرت سن کر یہاں چلے آئے۔ دل میں یہ امید بھی ہوگی کہ پرانی شناسائی کے ناطے گلکرسٹؔ ضرور معاونت کرے گا اور ایسا ہوا بھی۔ اہلِ سادات ہونے کے ناتے کچھ تو میر بہادر علی حسینیؔ مدد کرتے ہیں اور کچھ گلکرسٹؔ مہربانی کرتا ہے اور فیضؔ فورٹ ولیم کالج میں نوکری سے لگ جاتے ہیں۔ گلکرسٹؔ کی ہی ایماء پر 'پند نامہ عطار' کا اردو ترجمہ کرتے ہیں۔ فیضؔ نے اپنی بقیہ زندگی کہاں گذاری، اس بارے میں کچھ پتہ نہیں چلتا۔

۱۔ **چشمہ فیض** : چشمۂ فیض خطی نسخے کی صورت میں ایشیاٹک سوسائٹی آف بنگال کی زینت بنا ہوا ہے۔ یہ فریدالدین عطارؔ کی فارسی تصنیف 'پند نامہ عطار' کا اردو ترجمہ ہے اور ۷۲ صفحات پر محیط ہے۔ اس مثنوی میں نصیحت آمیز باتیں بتائی گئی ہیں۔ مثنوی ۱۲۱۸ھ مطابق ۱۸۰۳ء میں مکمل ہوئی تھی۔

سید علی جعفری

سید علی جعفریؔ، میر شیر علی افسوسؔ کے بیٹے تھے۔ ڈاکٹر سمیع اللہ نے وارثتے کے حوالے سے لکھا ہے کہ افسوسؔ کے انتقال (۱۹؍ دسمبر ۱۸۰۹ء) کے بعد انہیں فورٹ ولیم کالج میں نوکری ملی۔ تنخواہ چالیس روپے ماہوار تھی۔

تاہم 'انالس آف دی فورٹ ولیم کالج' کے ضمیمے میں جن منشیوں کو ہندوستانی شعبے سے ۱۸۱۹ء میں متعلق دکھایا گیا ہے، ان میں میر سید علی کی تاریخ تقرری جولائی ۱۸۰۷ء دکھائی گئی ہے۔ اس وقت تارنی چرن متر ہیڈ منشی تھے اور میر بخشش علی سکنڈ منشی۔

کالج ریکارڈ میں آپ کا نام ۱۸۳۰ء تک ملتا ہے۔ اس سے قیاس کیا جاسکتا ہے کہ آپ ۱۸۳۰ء تک تو کالج سے وابستہ تھے ہی۔ جون ۱۸۳۰ء میں رڈلؔ نے حکومت کو ان منشیوں کی فہرست بھیجی تھی، جو اس وقت تک کالج میں تھے۔ وہ فہرست حسب ذیل ہے۔ سید علی کا نام فارسی شعبے میں ملتا ہے۔

قربان علی۔ حسام الدین۔ میر سید علی۔ عبد الاحد۔ غلام فرید۔ (منشی)۔ تنخواہ چالیس روپے۔

محمد طٰہٰ .... (خوش نویس)۔ تنخواہ پچاس روپے

(فورٹ ولیم کالج، وارثتے، صفحہ: ۱۳۹-۴۰)

اس کے بعد کب تک رہے پتہ نہیں۔ پنشن پانے والوں کی فہرست میں بھی آپ کا نام نہیں ہے۔ ممکن ہے آپ نے استعفیٰ دیدیا ہو۔ آپ کی صرف ایک ہی تصنیف کا پتہ چلتا ہے۔

۱۔ **گلشنِ اخلاق** : سید علی اپنے والد شیر علی افسوسؔ کی زندگی میں گلشنِ اخلاق ترتیب دے چکے تھے۔ (۱۸۰۹ء)۔ یہ ایک مختصری کتاب ہے جس میں نصیحت آموز باتیں بتائی گئی ہیں۔ ہر باب کو ایک گلشن کہا گیا ہے اور ہر گلشن میں کئی روشیں دکھائی گئی ہیں۔ یہ روشیں اخلاقیات سے بحث کرتی ہیں۔ اس کا قلمی نسخہ ایشیاٹک سوسائٹی آف بنگال میں موجود ہے۔

غلام حیدر عزتؔ

غلام حیدر عزتؔ کو عتیق صدیقی فورٹ ولیم کالج کے ملازمین میں شمار نہیں کرتے۔ (گلکرسٹ اور اس کا عہد، صفحہ: ۲۰۰) تاہم بقول تھامس روبک (مرتب انالس آف دی کالج آف فورٹ ولیمؔ) غلام حیدر نامی ایک شخص کالج میں اسسٹنٹ لائبریرین کے عہدے پر ستمبر ۱۸۰۱ء میں فائز ہوا تھا۔ ہوسکتا ہے کہ یہی غلام حیدر عزتؔ ہوں، جنہیں منشی نہ ہونے کی وجہ سے انشا پرداز نہ گردانا گیا ہو۔ ڈاکٹر سمیع اللہ انہیں غیر معروف مصنفین میں جگہ دیتے ہیں۔ (فورٹ ولیم کالج: ایک مطالعہ، صفحہ: ۱۶۵) غلام حیدرؔ نام کا ایک اور شخص یکم مئی ۱۸۴۳ء میں ہندوستانی establishment میں مقرر ہوا تھا۔ (بحوالہ ششر کمار داس) لیکن ایسکے بارے میں تفصیلات دستیاب نہیں ہیں۔ ہوسکتا ہے کہ غلام حیدر عزتؔ نے بحیثیت اسسٹنٹ لائبریرین دس سال تک کام کیا ہو۔ کیونکہ مولوی کریم

الدین کی تقرری یکم اکتوبر ۱۸۱۱ء میں ہوئی تھی۔ بہر حال، غلام حیدر عزت کی ایک ہی تصنیف دستیاب ہے اور وہ بھی قلمی نسخے کی صورت میں۔ ایشیاٹک سوسائٹی لائبریری میں اسکا نمبر ۱۱۵ ہے۔

۱- **قصہ حسن و عشق** : اس قلمی نسخے میں کل صفحات ۱۹۹ ہیں۔ غلام حیدر نے اصل مصنف کا نام نہیں بتایا ہے۔ صرف اتنا لکھا ہے کہ :

''کسی استادِ کامل نے فارسی میں نظم کرکے' آپ گلشنِ عشق' نام رکھا تھا۔ از بسکہ اس کی تمہید طویل۔ اور الفاظ ادق۔ اور عبارت رنگین۔ اور صنعت اشعار اور فصاحتِ گفتار کے سبب سے مطلب فہمی میں توقف ہوتا تھا۔ اس واسطے منشی المناشی محمد وارث نے اسے مختصر کرکے نثر میں لکھا۔ اب غلام حیدر عزت نے ۱۲۱۸ ہجری قدسی سلطنت میں شاہ عالم بادشاہ غازی خلد اللہ ملکہٗ کی اور حکومت میں زبدۂ نوینان عظیم الشان، مشیرِ خاص کیوان بارگاہِ انگلستا نمارکوئس ولزلی گورنر جنرل لارڈ مارنگٹن بہادر دام اقبالہٗ کی، اور حسبِ حکم جان گلکرسٹ بہادر دام حشمۂ کے زبانِ ریختے میں نثر کیا اور حسن وعشق نام رکھا۔'' ۱

(قلمی نسخہ۔حسن وعشق)

عزت کی نثر بے حد رواں اور خوب صورت ہے۔ انہوں نے اپنی شاعرانہ صلاحیتوں کا بھی جگہ بہ جگہ مظاہرہ کیا ہے۔ اس داستان میں بھی عام داستانوں کی طرح ایک لاولد بادشاہ آسمان جاہ کی اولاد ہونے اور دوسرے عجیب وغریب واقعات پیش آنے کا تذکرہ ملتا ہے۔

کالج کے غیر متعلق مصنفین

کلکتے میں فورٹ ولیم کالج کے قیام کے بعد ہندوستان کے مختلف گوشوں سے اہلِ علم یہاں کا رخ کرنے لگے تھے۔ اس کے پیچھے کچھ تو ان کی اردو نوازی کام کر رہی تھی اور کچھ روزگار کی خواہش، شہرت کی تمنا اور صاحبانِ عالیشان سے قربت کا جذبہ کارفرما تھا۔ ان میں سے کچھ تو باقاعدہ بلوائے گئے تھے اور کچھ آپ ہی آپ وارد ہوئے تھے۔ ان میں سے چند باضابطہ طور پر فورٹ ولیم کالج میں منشی کے عہدے پر فائز ہوگئے اور چند ایسے بھی تھے جنہیں باقاعدہ ملازمت تو نہیں ملی تاہم ان کی قابلیت کے پیشِ نظر ترجمہ، تصنیف وتالیف کا کام سونپا گیا۔ ذیل میں ایسے ہی چند حضرات کے ادبی

کاموں کا جائزہ لیا گیا ہے۔

بینی نارائن

بینی نارائن اپنی تصنیف' چار گلشن' کے دیباچے میں اپنے حالات رقم کرتے ہیں جس سے پتہ چلتا ہے کہ بینی نارائن کا پورا نام بینی نارائن تھا۔ ان کے والد کا نام شودرشٹ نارائن اور دادا کا نام مہاراجہ پچھی نارائن (مرحوم) تھا۔ آپ کھتری قوم سے تھے اور لاہور میں رہتے تھے۔ ۱۲۱۵ھ میں کلکتہ تشریف لائے۔ آپ کے بڑے بھائی رائے کھیم نارائن صاحب (جو رند تخلص رکھتے تھے اور ایک اچھے شاعر تھے۔) نواب سعادت علی خاں بہادر کے وکیل تھے۔ گیارہ برس تک بینی نارائن بیکاری میں مبتلا رہے۔ ایک دن کسی منشی امام بخش کو قصہ چار گلشن سنا رہے تھے۔ ان صاحب کو یہ قصہ بہت پسند آیا اور انہوں نے اسے ضبطِ تحریر میں لانے کے لئے کہا۔ (قلمی نسخہ، چار گلشن، ایشیاٹک سوسائٹی آف بنگال)

یہ زمانہ لارڈ منٹو کا تھا (۱۲۲۵ھ مطابق ۱۸۱۲ء)۔ کہانی لکھ کر وہ کپتان ٹیلر صاحب کے پاس لے گئے۔ انہوں نے اسے پسند کیا اور بینی نرائن انعام سے نوازے گئے۔ بینی نارائن نے زندگی کے باقی ایام کہاں اور کن حالات میں گذارے، اس بارے میں قطعی طور پر کوئی کچھ نہیں کہہ سکتا۔ آپ سے درج ذیل تصانیف وابستہ ہیں۔

۱- **چار گلشن** : یہ ایک افسانوی داستان ہے جو شاہ کیوان اور شہزادی فرخندہ بخت کے رومان کے ارد گرد گھومتی ہے۔ یہ ۱۸۱۰ء مطابق ۱۲۲۵ھ میں تصنیف ہوئی۔ اس پر بینی نارائن کو ساٹھ روپے بطور انعام ملے تھے۔ (وارثے، صفحہ:۱۰۴)

۲- **دیوانِ جہاں** : یہ اردو شعراء کا ایک تذکرہ ہے جو بینی نارائن نے تھامس روبک کی فرمائش پر ترتیب دیا تھا۔ اکثر محققین اسکے اختصار کے پیشِ نظر اسے تذکرہ کے بجائے گلدستہ کہتے ہیں۔ یہ ۱۸۱۲ء میں تصنیف ہوئی۔ اس تذکرے کی اہمیت اس میں ہے کہ اس کی وجہ سے بہت سے مقامی شعراء کا نام اور کلام محفوظ ہوگیا ہے۔ اس کا قلمی نسخہ ایشیاٹک سوسائٹی آف بنگال میں محفوظ ہے۔

۳- **تنبیہ الغافلین** : مولانا شاہ رفیع الدین ابن شاہ ولی اللہ دہلوی کی فارسی تصنیف کا

اردو ترجمہ ہے۔ اس میں احادیث سے بحث ہے۔ بقول جاوید نہال :

'تنبیہ الغافلین' کا کوئی قلمی نسخہ کلکتہ کے بڑے بڑے کتب خانوں میں بھی دستیاب نہیں ہو سکا۔ لیکن انڈیا آفس لائبریری میں اس کا ایک خطی نسخہ موجود ہے۔'' (انیسویں صدی میں بنگال کا اردو ادب، صفحہ:۱۷۲)

اس کے علاوہ ڈاکٹر سمیع اللہ نے ڈاکٹر سید حنیف نقوی کے مضمون 'رائے بنی نارائن دہلوی' (مطبوعہ نوائے ادب، اپریل ۱۹۷۷ء) کے حوالے سے لکھا ہے کہ بنی نارائن کی مزید چار تخلیقات ہیں جن کے قلمی نسخے مختلف لوگوں کی ذاتی تحویل میں ہیں یا کسی لائبریری میں محفوظ ہیں۔ مثلاً تفریح طبع' (۱۸۱۷ء) کا نسخہ ڈاکٹر حنیف نقوی کی ذاتی ملکیت ہے تو 'نو بہار' (۱۸۲۴ء) حکیم سید محمد تقی حسن بلخی متوطن فتوحہ ضلع پٹنہ کی۔ 'باغ عشق' (۱۸۲۴ء) کا نسخہ انجمن ترقی اردو ہند، دہلی کے کتب خانے میں محفوظ ہے تو 'بہار عشق' جس کا ذکر بنی نارائن اپنی ایک اور تصنیف 'نو بہار' کے دیباچے میں کرتے ہیں، کا نسخہ کہیں دستیاب نہیں ہے۔ (فورٹ ولیم کالج: ایک مطالعہ، ڈاکٹر سمیع اللہ، صفحہ:۱۷۱)

گیان چند جین بھی اپنی کتاب 'اردو کی نثری داستانیں' میں بنی نارائن کی تصانیف سے متعلق فرماتے ہیں :

''نو بہار یعنی گل صنوبر۔ اسکی تاریخ ۱۸۲۴ء ہے۔ ایک دن منشی امام بخش (مولوی امام بخش صہبائی نہیں۔ یہ امام بخش کلکتے میں رہتے تھے۔) نے کہا کہ سابق میں باسط خاں نے 'قصہ گل صنوبر' تصنیف کیا تھا لیکن کالج کونسل نے ناپسند کر کے واپس کر دیا۔ اب تم اسے نظم ونثر سے آراستہ کر کے لکھو۔ جہاں نے دو ہفتے میں فارسی سے ترجمہ کر کے مکمل کر دیا۔ اسکا واحد قلمی نسخہ سید محمد تقی بلخی متوطن ضلع پٹنہ کی ملک ہے۔ قاضی عبدالودود نے اس نسخے کا تعارف رسالہ نیا دور، لکھنؤ، جولائی ۱۸۵۹ء میں شائع کیا ہے۔'' (صفحہ:۲۳۸)

'باغ عشق' سے متعلق گیان چند جین کہتے ہیں :

''باغ عشق (۱۸۲۴ء) یہ جامی کی لیلیٰ مجنوں کا ترجمہ ہے۔ منظوم دیباچے میں لکھتے ہیں کہ اس سے پیشتر چار گلشن، قصہ بہار عشق، گلزار حسن یعنی

ہندی یوسف زلیخا، دیوان جہاں اور گل صنوبر لکھ چکے تھے۔ اس کا مخطوطہ انجمن ترقی اردو ہند کے کتب خانے میں محفوظ ہے۔'' (صفحہ:۲۳۸)

مرزا علی لطف

مرزا علی لطف کے خودنوشت حالات کے مطابق ان کا نام میرزا علی اور تخلص لطف تھا۔ والد کا نام کاظم بیگ خاں تھا۔ ہجری تخلص۔ فارسی میں اشعار خوب کہتے تھے۔ لطف فارسی میں آپ ہی سے اصلاح لیا کرتے تھے۔ استرآباد کے رہنے والے تھے۔ ۱۱۵۴ھ میں نادر شاہ کے ساتھ شاہجہاں آباد تشریف لائے اور ابوالمنصور خاں صفدر جنگ کی وساطت سے بادشاہی عنایات سے سرفراز ہوئے۔

عتیق صدیقی انہیں فورٹ ولیم کالج کے غیر متعلق ملازمین میں شمار کرتے ہیں۔ ششتر کمار داس نے اپنی کتاب میں منشیوں کی جو فہرست شائع کی ہے اس میں بھی مرزا علی کا نام کہیں نظر نہیں آتا۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ وہ کالج کے باقاعدہ ملازم نہیں تھے۔ درج ذیل تصنیف ان سے یادگار ہے۔

۱۔ **گلشن ہند** : یہ علی ابراہیم خاں کی فارسی تصنیف 'تذکرہ گلزار ابراہیم' (۱۷۸۴ء) کا اردو ترجمہ ہے۔ گلکرسٹ کی نظروں سے جب علی ابراہیم خاں کا تذکرہ گذرا تو اسے اسکے اردو ترجمے کی خواہش ہوئی۔ لطف نے گلکرسٹ کی ایماء پر ہی یہ ترجمہ کیا تھا۔ لکھتے ہیں :

''ایک مدت سے صاحب عالی حوصلہ کو خیال اس بات کا تھا کہ اگر بیان اس کا مفصل زبان ریختہ میں کیا جائے تو خوب ہو، اور ہر ایک شاعر کی پوری غزل اپنا جلوہ دکھائے تو نہایت طبع کو مرغوب ہو۔ مبتدی اس سے بڑا مزہ پائیں گے۔ اور نومشق کیفیت بہت اٹھائیں گے۔ چنانچہ اس خیرخواہ خفی وجلی، میرزا علی کو، کہ لطف تخلص کرتا ہے، نہایت محبت واخلاق سے فرمایا کہ اگر تن دہی اس مقدمے میں کرے، تو ہم اس تذکرے کو اپنی طرز پر لکھیں۔'' (دیباچہ گلشن ہند)

گرچہ لطف اس وقت حیدرآباد کی سیر کا ارادہ رکھتے تھے تاہم گلکرسٹ کی محبت کے پیش نظر انہوں نے اس کام کا بیڑا اٹھایا اور ۱۲۱۵ھ مطابق ۱۸۰۱ء میں اسے مکمل کیا نیز نام اس کا 'گلشن ہند' رکھا۔ 'گلشن ہند' کے دیباچے میں لطف کہتے ہیں کہ انہوں نے اس کی دو جلدیں بنائی ہیں۔ جلد اوّل

میں سلاطین نامدار، امرائے عالی مقدار اور شعرائے صاحب وقار کہ صاحب دیوان ہیں، کے حالات اور نمونہ کلام درج کئے گئے ہیں۔ جلد دوم میں کہ شعرائے گمنام یا نومشقوں کا بیان ہے۔ ۱

بقول لطف، انہوں نے اس میں خاصہ اضافہ بھی کیا ہے۔ ۲

لیکن انہوں نے صرف انہی شعراء کا تفصیلی مطالعہ پیش کیا ہے جن سے قربت رکھتے تھے۔ تحقیقی نقطۂ نظر سے کسی شاعر کے بارے میں جاننے یا اس کے تفصیلی حالات پیش کرنے کی کوشش نہیں کی۔ اس تذکرے کی دوسری جلد کا پتہ نہیں چلتا۔

نہال چند لاہوری

عتیق صدیقی نے نہال چند لاہوری کو کالج کے غیر متعلق مصنفین میں شمار کیا ہے۔ انہوں نے 'مذہب عشق' کے دیباچے میں اپنے مختصر حالات بیان کئے ہیں جس کے مطابق وہ شاہجہاں آباد کے رہنے والے تھے۔ اور آب و خورش انہیں ہندوستان کے دارالامارت کلکتہ میں کھینچ لائی تھی۔ کپتان ولورٹ کے طفیل وہ گلکرسٹ تک پہنچے اور اس کی ایماء پر 'تاج الملوک اور بکاؤلی' کے فارسی قصے کو ہندی ریختے کا جامہ پہنایا۔ عہد ولزلی میں یہ کتاب مکمل ہوئی۔ نہال چند لاہوری کی زندگی کے حالات اس سے زیادہ دستیاب نہیں ہوتے۔

۱- **مذہب عشق** : نہال چند لاہوری کی تصنیف 'مذہب عشق' ایک فارسی نثر قصے سے ماخوذ ہے، جسے عزت اللہ بنگالی نے لکھا تھا۔ بقول خلیل اللہ داؤدی عزت اللہ بنگالی کے اس قصے (۱۱۳۴ھ) سے پہلے ایک اردو مثنوی 'تحفۂ مجالس سلاطین' ملتی ہے اور دوسرا ایک دکنی نسخہ ہے جو 'قصہ گل بکاؤلی' سے متعلق ہے۔ پنڈت دیا شنکر نسیم نے اپنی مثنوی 'گلزار نسیم' میں 'مذہب عشق' سے استفادے کی تو بات کہی ہے تاہم ان مثنویوں کا کوئی حوالہ نہیں دیا جو 'گلزار نسیم' سے بہت پہلے لکھی گئی تھیں۔ مثلاً ۱۲۱۲ھ میں ریحان الدین ریحان لکھنوی کی اردو مثنوی اور رفعت لکھنوی کی فارسی مثنوی۔ ۱

بہر حال مذہب عشق میں چھبیس ابواب ہیں۔ حمد و ثنا، نعت و منقبت کے بعد اصل قصہ شروع ہوتا ہے۔ ہر باب میں ایک داستان ہے اور ہر باب کا ایک عنوان ہے۔ نہال چند لاہوری کا یہ ترجمہ ۱۸۰۳ء مطابق ۱۲۱۷ھ میں مکمل ہوا اور ۱۸۰۴ء میں منظر عام پر آیا۔ اس کتاب کے بیشتر ایڈیشن نکلے تھے۔ انگریزی میں اسکا ترجمہ لفٹنٹ آر۔ پی۔ انڈرسن نے کیا تھا جو دہلی سے ۱۸۵۱ء میں شائع ہوا تھا۔

۱- گلکرسٹ اور اس کا عہد، محمد عتیق صدیقی، صفحہ: ۱۰۶

۲- گلشن ہند، مرتبہ مولوی عبدالحق، مولوی شبلی۔ کتب خانہ آصفیہ، حیدرآباد دکن اور دارالاشاعت پنجاب، ۱۹۰۶ء)

۳- مقدمہ۔ مذہب عشق۔ مرتبہ خلیل الرحمٰن داؤدی۔ مجلس ترقی ادب، لاہور، ۱۹۶۱ء

مرزا جان طپش

کسی تذکرہ نویس نے طپش کی سال ولادت تحریر نہیں کی ہے لیکن کریم الدین مصنف 'طبقات الشعرائے ہند' کے یہ لکھنے سے کہ ۱۱۹۸ھ میں جب طپش سولہ سال کے تھے تو ان کو شوق شعر ہوا، سبھوں نے ان کی تاریخ پیدائش ۱۱۸۲ھ فرض کر لی ہے۔ ۱

مرزا جان طپش کے بارے میں اقبال عظیم فرماتے ہیں کہ ان کا اصلی نام مرزا محمد اسمٰعیل تھا لیکن عام طور پر وہ مرزا جان کے نام سے مشہور تھے۔ ان کے اجداد بخارا کے رہنے والے تھے اور ان کا سلسلۂ نسب حضرت جلال الدین بخاری تک پہنچتا ہے۔ طپش کے والد مرزا یوسف بیگ پہلے شخص تھے جو بخارا سے ہندوستان آ کر دربار دہلی سے منسلک ہوئے جہاں ۱۱۸۲ھ میں طپش دہلوی کی ولادت ہوئی۔ پیدائش جب عربی اور فارسی میں ان کی تعلیم باضابطہ اور مکمل ہوئی اور سنسکرت زبان میں بھی انہوں نے کافی مہارت حاصل کی۔ باپ کی طرح سپاہی پیشہ تھے، اس لئے شاہ عالم بہادر کے ولی عہد مرزا جواں بخت جہاندار شاہ کے دربار میں فوجی خدمات پر مامور ہوئے۔ ۱۱۹۸ھ میں جہاندار شاہ کے ساتھ لکھنؤ آئے۔ جب وہ لکھنؤ سے بنارس گئے تو طپش پھر ہمراہ ہو لئے۔ ۱۲۰۱ھ میں جہاندار شاہ کے انتقال کے بعد شعر و سخن کی محفلیں درہم برہم ہو گئیں۔ طپش تلاش معاش میں بنارس ہوتے ہوئے بنگال پہنچے۔ ڈھاکہ میں نواب سید احمد علی خاں شمس الدولہ بہادر کے مصاحب خاص مقرر ہوئے۔ یہاں انہوں نے نواب کی فرمائش پر 'شمس البیان فی مصطلحات ہندوستان' نامی کتاب لکھی۔ جب نواب شمس الدولہ قید کر کے کلکتہ لے جائے گئے تو طپش ان کے ساتھ تھے۔ یہ زمانہ فورٹ ولیم کالج کے شباب کا زمانہ تھا۔ ۲

طپش کی صلاحیتوں کا اندازہ کالج کے ارباب اقتدار کو بھی ہوا ہوگا۔ عنایت اللہ کنبوہ کی فارسی تصنیف کا اردو ترجمہ کرنے کا کام طپش کے سپرد ہوا۔ طپش نے ترجمہ کیا اور 'بہار دانش' نام لکھا۔

طپش کا انتقال کب اور کہاں ہوا، اس بارے میں اختلاف رائے ہے۔

اسپرنگر نے 'تذکرۂ عشق' کے حوالے سے لکھا ہے کہ 'وہاں سے کلکتے گئے جہاں کچھ عرصے قید رہے۔ رہائی پانے کے بعد انتقال کیا'۔ قید میں انہوں نے ریختہ میں 'یوسف و زلیخا' لکھی۔

بقول خلیل الرحمٰن داؤدی طپش کے قید ہونے کی بات کسی دوسرے تذکرے میں نہیں ملتی نہ ہی

۱- طبقات شعرائے ہند، تالیف کریم الدین، مقدمہ محمود الٰہی، اتر پردیش اردو اکادمی لکھنؤ، ۱۹۸۳ء، صفحہ ۱۹۹

۲- مشرقی بنگال میں اردو، سید اقبال عظیم، مشرقی کو آپریٹو بک کنسٹرن ڈھاکہ، اگست ۱۹۵۴ء، صفحہ ۲۵-۲۶

یوسف زلیخا نامی کسی تصنیف کا پتہ چلتا ہے۔

ڈاکٹر سمیع اللہ (فورٹ ولیم کالج ایک مطالعہ، صفحہ: ۱۷۵) عشقی کے تذکرہ کی روشنی میں بنگال میں طپش کی پہلی منزل مرشد آباد بتاتے ہیں، دوسری ڈھاکہ اور تیسری کلکتہ۔ انہوں نے عشقی کے ہی حوالے سے طپش کے 'بحکم صاحبان عالیشان کونسل' ایک مقدمے میں ماخوذ ہو کر کلکتہ میں محبوس ہونے کی بات بھی کہی ہے۔ لیکن جیسا کہ پہلے بھی کہا جا چکا ہے کہ دوسرے تذکرہ نگار اس باب میں خاموش ہیں۔ 'بہار دانش' کے مرتب خلیل الرحمن داؤدی کا کہنا ہے کہ :

''طپش فورٹ ولیم کالج کے قیام (۱۸۰۰ء) تک ڈھاکے میں ہی رہے اور فورٹ ولیم کالج کے قیام کے بعد ڈھاکے سے کلکتے چلے آئے۔''[۱]

بقول داؤدی فورٹ ولیم کالج میں طپش کا کام ترجمہ شدہ کتابوں پر نظر ثانی کرنا تھا۔ طپش نے فورٹ ولیم کالج کے قیام کے دوران کوئی نثر نہیں لکھی، نہ ہی کسی کتاب کے ترجمہ و تالیف کا کام کیا۔ ان کی صرف ایک اردو مثنوی 'بہار دانش' فورٹ ولیم کالج کے دنوں کی یادگار ہے جو فارسی کے کسی قصے سے ماخوذ ہے۔ طپش کا کلیات فورٹ ولیم کالج نے خریدا تھا جو کالج کی جانب سے ۱۸۱۱ء میں شائع ہوا تھا۔

طپش کے آخری ایام کی کوئی تفصیل فراہم نہیں ہوتی۔ قیاس ہے کہ وہ دلی چلے گئے تھے۔ بقول اشپرنگر انکا انتقال ۱۸۱۶ء سے قبل ہو چکا تھا جبکہ قاضی عبدالودود کے مطابق انکا انتقال ۱۸۱۷ء میں ہوا۔ طپش سے درج ذیل تصانیف یادگار ہیں۔

۱- **گلزار مضامین** : یہ طپش کا مجموعۂ کلام ہے۔ عبدالغفور نساخ کا کہنا ہے کہ (قطعۂ منتخبہ) جن دنوں طپش لکھنؤ میں تھے، انہی دنوں انہوں نے اپنا دیوان مرتب کیا تھا اور اس کا تاریخی نام 'گلزار مضامین' رکھا تھا۔ بعد ازاں انہوں نے اسے اپنے کلیات میں شامل کر لیا تھا۔

۲- **شمس البیان فی مصطلحات ہندوستان** : یہ طپش کی سب سے اہم تصنیف ہے۔ انہوں نے یہ رسالہ ان دنوں تحریر کیا تھا جن دنوں وہ نواب شمس الدولہ سید احمد علی خان کی مصاحبت میں تھے اور نواب موصوف کے خطاب کی رعایت سے اس کا نام رکھا تھا۔ داؤدی صفحہ ۵ پر لکھتے ہیں :

۱- بہار دانش، مرتبہ داؤدی، صفحہ: ۶

''بالآخر ڈھاکہ پہنچ کر شمس الدولہ نواب سید احمد علی خان کے متوسلین میں شامل ہو گئے۔ یہاں کے قیام میں ہی ۱۲۰۷ھ مطابق ۱۷۹۳ء میں انہوں نے اردو محاورات، روز مرہ اور ضرب الامثال پر اپنی اولین کتاب 'شمس البیان فی مصطلحات ہندوستان' کے عنوان سے لکھی۔''[۱]

اس کے بعد صفحہ ۱۶ پر لکھتے ہیں :

''یہ اس زمانے کی یادگار ہے جب طپش مرشد آباد میں نواب شمس الدولہ سید احمد علی خان کی مصاحبت میں تھے۔''[۲]

ایک ہی مقدمے میں دو طرح کے بیانات کچھ عجیب معلوم ہوتے ہیں۔ حالانکہ 'شمس البیان فی مصطلحات ہندوستان' کے دیباچے سے طپش کے لفظوں میں اس بات کی وضاحت ہو جاتی ہے (بحوالہ: خلیل الرحمن داؤدی) کہ یہ کتاب مرشد آباد میں تصنیف ہوئی تھی۔

طپش لکھتے ہیں :

''در سن یک ہزار دو صد و ہفت از ہجرت نبوی صلی اللہ علیہ وسلم در شہر محرم الحرام بتاریخ بست و دو در بلدۂ مرشد آباد بہ اتمام رسید۔''[۳]

اس کتاب میں طپش نے ۱۱۷۵ اردو مصطلحات و محاورات کو بترتیب حروف تہجی مرتب کیا ہے اور ہر ایک محاورے کی سند میں اشعار پیش کیے ہیں۔ اردو محاورات کی تشریح فارسی زبان میں لکھی گئی ہے۔ دیباچہ بھی فارسی میں ہے۔

۳- **بہار دانش** : یہ طپش کی لکھی ہوئی مثنوی ہے جو عنایت اللہ کے فارسی قصہ سے ماخوذ ہے۔ کہانی جہاندار شاہ اور بہرہ ور بانو کے ارد گرد گھومتی ہے۔ اسے مرزا شیر علی اور محمد فیض اللہ نے محمدی چھاپہ خانے سے ۱۲۵۵ھ میں طبع کرایا تھا۔ بقول ناشرین ''یہ مثنوی مرزا جان طپش مرحوم نے ۱۲۱۷ھ میں بموجب فرمائش صاحبانِ کونسل، خاص و عام کے سمجھنے کیلئے اردو میں ترجمہ کیا تھا مگر ''باعثِ عدم چھاپہ ہونے کے شوق مند سب فائدے سے اس قصے کے مایوس رہتے تھے۔'' اس لئے ناشرین نے اس کو چھاپنا ضروری سمجھا اور ۱۲۵۵ھ میں طبع کرایا۔

۱- بہار دانش، مرتبہ داؤدی، صفحہ: ۶ ۲- ایضاً صفحہ: ۱۶

۳- بحوالہ دیباچہ بہار دانش، مرتبہ داؤدی

باسط خاں باسطؔ

باسط خاںؔ کی تصنیف 'گلشنِ ہند' قلمی نسخے کی صورت میں ایشیاٹک سوسائٹی آف بنگال میں موجود ہے۔ اسکے دیباچے سے ہی انکے حالات کا پتہ چلتا ہے۔ حمد ونعت کے بعد باسطؔ کا کہنا ہے کہ ان کا نام باسط خاں اور تخلص باسطؔ ہے۔ بزرگوں کا پیشہ سپہ گری رہا ہے اس لئے بادشاہوں کے دربار میں بار پانا ان کیلئے بڑی بات نہ تھی۔ محمد شاہ بادشاہ متخلص بہ آفتابؔ کے عہد میں باسطؔ کی پیدائش ہوئی۔ ان کی وفات کے بعد دِلّی میں زبردست تباہی مچی۔ جب وہ پانچ سال کے تھے تو اپنے والد مراد خاںؔ کے ہمراہ شاہ جہاں آباد چھوڑ کر نکل گئے۔ شاید اسکے بعد ہی عظیم آباد آئے۔ لکھتے ہیں :

> ''چھوٹی عمر میں اس فدوی کے آنے کا اتفاق عظیم آباد کو ہوا۔ صوبۂ عظیم آباد، مہاراجہ کلیان سنگھ بہادر خیر خواہ کمپنی عالی کے صاحبزادوں کے ساتھ ہم مکتب اور ہم نشیں رہا۔ ان کی بدولت اچھے اچھے عالم، فاضل، قابل، ہوشمند، دانا، بینا، سخن صاحب دلاں باشندۂ ہندوستاں کی صحبت پائی۔'' ا

ہوش سنبھالنے کے بعد 'چندے نواب صاحب مبارک الدولہ بہادر مرحوم فیروز جنگ صوبۂ بنگ اور چندے نواب دلاور جنگؔ' کی صحبت میں رہے۔ اس کے بعد 'گلکرسٹؔ کی فرمائش پر نظم و نثر کو ملا کر زبانِ ریختہ ہندی میں' انہوں نے یہ کتاب لکھی۔

۱- **گلشنِ ہند** : باسطؔ اسے ترجمہ کہتے ہیں لیکن یہ نہیں بتاتے کہ کس کتاب کا ترجمہ ہے۔ دوسری طرف لکھتے ہیں کہ :

> ''اپنی تصنیف میں اچھی اچھی دلچسپ باتیں جمع کر کے اس مجمع سخن کا نام گلشنِ ہند رکھا۔'' ۲

قصہ تمام ہونے پر جب تاریخِ تصنیف لکھتے ہیں تو پتہ چلتا ہے کہ یہ 'قصہ گل وصنوبر' کا ترجمہ ہے۔ فرماتے ہیں :

> ''آگے کہوں تو کیا کہوں۔ بات تو تمام ہو چکی۔ بیان تاریخ یوں ہے کہ عید کے مہینے میں 'قصہ گل وصنوبر' کا ترجمہ کرنا شروع کیا تھا۔ ربیع الثانی کے مہینے

۱- دیباچہ قلمی نسخہ گلشن ہند، ایشیاٹک سوسائٹی آف بنگال ۲- ایضاً

> میں پانچویں تاریخ روز دوشنبہ ۱۸۰۳عیسوی میں تمام کیا۔ 'گلشنِ ہند' اس ترجمہ کا نام رکھا۔ تاریخ اس کتاب کی دو نکالی ہیں۔ ایک تو ہجری اور دوسری فصلی ہجری ہے۔ خلدِ روئے بریں فصلی ہے۔ چشمِ خوب رویاں (ہجری)۔ جو جس کی پسندِ خاطر ہو وہی خوب ہے۔'' (دیباچہ قلمی نسخہ گلشن ہند)

'گلشنِ ہند' میں چھوٹی چھوٹی حکایتیں ہیں۔ یہ حکایتیں نصیحت آموز ہیں۔

مندرجہ بالا مصنفین کے علاوہ بھی کالج سے متعلق اور غیر متعلق ایسے کئی شعراء وادباء گذرے ہیں، جنہوں نے اپنی علمی لیاقت کی بناپر فورٹ ولیم کالج کی نمایاں خدمات انجام دیں۔ ان میں سے چند لوگ تو اپنے متعلق کچھ بتائے بنا ہی گذر گئے۔ آج اگر ہمارے درمیان وہ زندہ ہیں تو صرف اپنے کارنامے کی بدولت۔ ایسا ہی ایک نام کالج سے غیر متعلق ایک شخص ابوالقاسم خاںؔ کا ہے۔ جس کی تصنیف 'حسنِ اختلاط' کوئی اہم تصنیف نہ ہوتے ہوئے بھی اس بنا پر یاد رکھی جائے گی کہ یہ اس کی طبع زاد تصنیف ہے اور فارسی آمیز اردو کے دور میں ہلکی پھلکی، سادہ، رواں، زبان میں گفتگو کرنے کی ایک کوشش بھی۔ اگلے صفحات میں میر ابوالقاسم خاںؔ کی زندگی اور اس کی تصنیف 'حسنِ اختلاط' کا جائزہ لینے کے علاوہ حسنِ اختلاط کا قلمی نسخہ بھی شامل کیا جا رہا ہے۔

●●●

میر ابوالقاسم خاں

میر ابوالقاسم خاںؔ وہ شخص ہے، جس نے گلکرسٹؔ کی اردو نوازی سے متاثر ہو کر قلم اٹھایا اور 'حسنِ اختلاط' تصنیف کی۔ یہ وہ زمانہ تھا جب کلکتہ کی سرزمین پر فورٹ کالج کی بنیاد پڑ چکی تھی اور گلکرسٹؔ کی سرپرستی میں ہندوستان بھر کے مایہ ناز انشاء پرداز کلاسیکی زبان میں لکھے گئے ادب کو اردو، ہندی، اور بنگلہ جیسی جدید ہند آریائی زبانوں کا جامہ پہنا رہے تھے۔ ایسے میں میر ابوالقاسم خاںؔ نے ۱۸۰۳ء میں 'تاریخ نما' کوئی چیز لکھی اور اسکا نام 'حسنِ اختلاط' رکھا۔ (اسے ہم تاریخ اس لئے نہیں کہہ سکتے کہ اس میں تاریخی واقعات کو سلسلہ وار بیان نہیں کیا گیا ہے)۔ یہ کتاب فورٹ ولیم کالج کی مطبوعہ کتابوں کی فہرست میں اپنا مقام رکھتی ہے حالانکہ محققین کی رائے ہے کہ اب اس کا کوئی بھی مطبوعہ نسخہ موجود نہیں ہے۔

میر ابو القاسم خاں اور تذکرے

میر ابوالقاسم خاںؔ کے متعلق اردو تذکرے خاموش ہیں۔ وہ کون تھا، کیا تھا، کہاں رہتا تھا، اس کے آبا و اجداد کا نام کیا تھا، ان سارے سوالوں کا کسی تذکرہ نگار کے پاس کوئی جواب نہیں۔ وفا راشدیؔ کی تصنیف 'بنگال میں اردو' اپنی کمیوں اور خامیوں کے باوجود بنگال میں اردو زبان و ادب کے آغاز و ارتقا سے متعلق ایک اہم اور معلوماتی کتاب ہے۔ اس کتاب میں صاحبِ تصنیف فورٹ

ولیم کالج سے متعلق مصنفین کی خدمات کا تو ذکر کرتا ہے لیکن غیر متعلق مصنفین کا نام تک نہیں لیتا۔ میر ابوالقاسم خاںؔ کا ذکر غالباً پہلی بار لکشمی ساگر وارشنے کی ہندی کتاب 'فورٹ ولیم کالج' میں نظر آتا ہے۔ 'حسنِ اختلاط' کے متعلق گلکرسٹؔ کی رائے نقل کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ :

> ''ایک دیسی سجن، جنھوں نے بڑے اتساہ کے ساتھ یہ مشرت سنگرہ تیار کیا ہے۔
> یہ ایک پری پک رچنا نہ ہو کر اس بات کا ادھارن ہے کہ پرَاتساہن ملنے پر ہم
> ان سے کیا آشا کر سکتے ہیں۔''[1]

اس کے بعد محمد عتیق صدیقیؔ اپنی کتاب 'گلکرسٹؔ اور اس کا عہد' میں ابوالقاسمؔ پر چند جملے لکھتے ہیں۔ بعد ازاں جاوید نہالؔ کی کتاب 'انیسویں صدی میں بنگال کا اردو ادب' کے صفحہ ۲۴۸ پر میر ابوالقاسم خاں اور اسکی کتاب 'حسنِ اختلاط' پر تفصیلی بحث ملتی ہے۔ عبیدہ بیگم اپنی کتاب 'فورٹ ولیم کالج کی ادبی خدمات' میں حسنِ اختلاط کے سلسلے میں مزید معلومات کا اضافہ کرتی ہیں لیکن ابوالقاسم خاںؔ کی زندگی کے حالات پردۂ خفا ہی میں رہتے ہیں۔ خود قاسمؔ نے اپنے بارے میں کوئی اطلاع نہیں دی ہے۔ اپنی کتاب 'حسنِ اختلاط' کے دیباچے میں وہ گلکرسٹؔ کی تعریف میں تو رطب اللسان ہوتا ہے لیکن اپنے بارے میں کچھ نہیں کہتا۔ جب وہ تمہید باندھ رہا ہوتا ہے تو اس کی باتوں سے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ اس کا نام 'سید ابوالقاسم سبزواریؔ' ہے حالاں کہ کتاب کے پہلے صفحے پر مصنف کا نام میر ابوالقاسم خان لکھا ہے۔ بہر کیف جاوید نہالؔ نے غالباً اس تمہید کی بنیاد پر یہ فرض کر لیا ہے کہ:

> ''میر ابوالقاسم سبزواریؔ کے آبا و اجداد ایران کے مردم خیز شہر سبزوار کے
> رہنے والے تھے اور ایران کے تاخت و تاراج کے وقت ان کا خاندان بھی
> ترکِ وطن کر کے ہندوستان میں سکونت پذیر ہو گیا تھا اور پھر سلطنتِ مغلیہ
> کے زوال، درانیوں اور مرہٹوں کے ہاتھوں دلی کی تاخت و تاراج کے
> وقت سید صاحب کا خاندان ہجرت کر کے کلکتے چلا آیا تھا اور مستقل سکونت
> اختیار کر لی تھی۔ سید صاحب کا حال اس سے زیادہ معلوم نہیں ہو سکا کیونکہ
> اردو ادب کے کسی تذکرے میں حسن اختلاط کا ذکر نہیں ملتا۔''[2]

جاوید نہالؔ نے اگر اس بیان کے تعلق سے کوئی ٹھوس ثبوت فراہم کیا ہوتا تو اعتراض کی گنجائش

۱- فورٹ ولیم کالج لکشمی ساگر وارشنے ،الہ آباد یونیورسٹی ،بسنت ،۲۰۰۲ء، ص: ۱۹۱

۲- انیسویں صدی میں بنگال کا اردو ادب، ڈاکٹر جاوید نہال ،صفحہ: ۲۰۳

نہیں رہتی لیکن انھوں نے یہ باتیں بغیر کسی حوالے کے کہی ہیں اس لئے معترضین کو موقعہ ہاتھ آجاتا ہے۔ قاسمؔ تمہید کے دوران کہتا ہے :

'......ان دو باتوں کی جبری کے باعث سید ابوالقاسم سبزواریؔ کو بھی اپنی زبان کے سنبھالنے کا اختیار نہ رہا پر نہ رہا اور کچھ نہ کچھ بولتے ہی بنا۔'[1]

جاوید نہالؔ نے ایک جگہ، پتہ نہیں کن وجوہات کی بنا پر، قاسمؔ کو نواب بھی لکھا ہے۔ (صفحہ ۴۰۳) جاوید نہالؔ نے 'حسنِ اختلاط' کے دیباچے کے حوالے سے یہ بات بھی غلط لکھی ہے کہ قاسمؔ اور گلکرسٹؔ کی ملاقات کسی نواب صاحب کے یہاں ہوئی تھی۔ اصل مخطوطے سے اس بات کی وضاحت ہوجاتی ہے کہ گلکرسٹؔ سے قاسمؔ کی ملاقات ایک فوجی افسر کے گھر پر ہوتی ہے۔ 'انیسویں صدی میں بنگال کا اردو ادب' میں قاسمؔ کا ذکر کرنے کے بعد جاوید نہالؔ اپنے ایک مضمون 'بنگال میں انیسویں صدی کی چند نثری تخلیقات' (مشمولہ مغربی بنگال میں اردو ادب' مطبوعہ مغربی بنگال اردو اکیڈمی، ۲۰۰۲ء) میں بھی سید ابوالقاسم خاںؔ کی زندگی کے حالات بغیر کسی حوالے کے بیان کرتے ہیں۔ اس مضمون میں وہ ابوالقاسم خاںؔ کو اسی شہر میں مدفون بتاتے ہیں اور تقسیمِ ہند تک ان کے خاندان سے متعلق اپنی معلومات کو کچھ اس طرح بیان کرتے ہیں گویا آنکھوں دیکھا حال بیان کر رہے ہوں :

''دلّی میں کچھ دنوں تک رہے۔ مگر سلطنتِ مغلیہ کے زوال اور جاٹوں اور مرہٹوں کی پیہم یورشوں کے نتیجے میں دلّی میں پھیلی ہوئی انارکی اور طوائف الملوکی سے گھبرا کر کلکتہ منتقل ہوگئے۔ یہیں پیوندِ زمین ہوئے۔ ان کا خاندان یہاں آباد تھا۔ تقسیمِ ہند کے بعد کلکتہ سے پاکستان چلا گیا تھا۔ دراصل میر ابوالقاسمؔ کے اسلاف اور ان کی اولادیں بار بار در بدر ٹھوکریں کھاتی رہیں۔ کہیں مستقل گھر نہیں بنا سکیں۔''[2]

نصیر الدین ہاشمی کتب خانۂ نواب سالار جنگ مرحوم کی اردو کتابوں کی وضاحتی فہرست تیار کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ :

''مصنف کا خاندان ایران سے ہندوستان آیا تھا۔ یہ نہیں معلوم ہوتا کہ ہندوستان

۱۔ قلمی نسخہ حسن اختلاط

۲۔ مشمولہ 'مغربی بنگال میں اردو ادب' مطبوعہ مغربی بنگال اردو اکیڈمی، ۲۰۰۲ء، صفحہ ۷۷

کے کس شہر میں بود و باش کی تھی۔ سید ابوالقاسم کلکتہ میں مقیم تھے۔ اگرچہ مؤلف اربابِ نثر اردو نے ان کو فورٹ ولیم کالج کے مصنفوں میں شامل نہیں کیا ہے مگر جیسا کہ اس کے دیباچہ سے معلوم ہوتا ہے وہ بھی ڈاکٹر گلکرسٹؔ کے متوسل تھے۔ افسوس ہے کہ ان کی تاریخ سے ان کے حالات پر روشنی نہیں پڑتی۔''[1]

نصیر الدین ہاشمی کا بیان بھی قیاسات پر مبنی ہے۔ قاسمؔ کا اپنے نام کے ساتھ سیدؔ اور سبزواری لکھنے سے اس بات کا اندازہ ہوجاتا ہے کہ وہ سبزوار کے رہنے والے تھے اور سید تھے۔ گلکرسٹ اور دوسرے افسران سے ان کی قربت کا اندازہ ان اشعار سے ہوجاتا ہے جو 'حسنِ اختلاط' کے دیباچے میں لکھے گئے ہیں۔ غرض 'وہ ایران سے ہندوستان آئے تھے' اور یہ کہ 'گلکرسٹ سے ان کے تعلقات تھے' کہنے سے کسی بہت بڑی حقیقت کا پتہ نہیں چلتا۔

ابوالقاسم خاںؔ بنگال کے کس خطے کا رہنے والا تھا، اس کے متعلق بھی کوئی کچھ نہیں جانتا۔ کلکتے میں اس کی ملاقات گلکرسٹؔ سے ہونے کی وجہ سے یہ فرض کرلیا گیا ہے کہ وہ کلکتے میں اقامت پذیر ہوگا۔ اس نے اپنی نثری کتاب 'حسنِ اختلاط' میں جا بجا اپنی شاعرانہ صلاحیتوں کا اظہار کیا ہے۔ یعنی اس نے کچھ اشعار نظم کئے ہیں اور ان شعروں میں اپنی اور گلکرسٹؔ کی ملاقات کا واقعہ قلم بند کیا ہے۔ قاسمؔ کو شاعر مان کر ہم نے شعرائے اردو کے تذکروں کا مطالعہ شروع کیا تو مرشد آباد سے متعلق ایک میر ابوالقاسمؔ نظر آیا جو شاعر تھا اور جس کا تخلص تھا مشتاقؔ۔ افسوسناک صورتحال یہ ہے کہ اس مشتاقؔ کے متعلق بھی کوئی اطلاع نہیں ملتی۔ کچھ تذکروں میں صرف نام ہے اور کچھ تو نام تک نہیں لیتے۔ 'حسنِ اختلاط' میں مصنف نے قدم قدم پر فارسی کے اشعار لکھے ہیں۔ ہم نے فارسی شعراء کے تذکروں کو بھی چھان ڈالا۔ ایک ایک تخلص پر غور کیا اور شاعر کا پورا نام جاننے کی کوشش کی وہ بھی اس امید پر کہ شاید اس نے فارسی شاعری کیلئے کوئی دوسرا تخلص رکھ چھوڑا ہو۔ تاہم کسی دوسرے تخلص کا بھی کوئی شاعر ایسا نہیں نظر آیا جس کا پورا نام میر ابوالقاسم خاںؔ یا سید ابوالقاسم خاں سبزواریؔ ہو۔ اگر ہم یہ مان لیں کہ جس مشتاقؔ میر ابوالقاسم کا ذکر ناسخؔ نے اپنے 'تذکرہ سخن شعراء' میں کیا ہے۔ یہ وہی قاسم ہے جس نے 'حسنِ اختلاط' لکھا ہے تو ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ قاسم سے متعلق ہماری معلومات میں ایک نیا اضافہ ہوا ہے اور وہ یہ کہ میر ابوالقاسم خاںؔ مصنفِ 'حسنِ اختلاط' مرشد آباد کا رہنے والا

۱۔ کتب خانۂ نواب سالار جنگ مرحوم کی اردو کتابوں کی وضاحتی فہرست، مرتبہ نصیر الدین ہاشمی، مطبع ابراہیمیہ، حیدر آباد، ۱۹۵۷ء

تھا۔لیکن یہ بھی محض قیاس آرائی ہوگی۔

ہم نے یہ فرض کرتے ہوئے کہ میر ابوالقاسم خاںؔ نے اپنا تخلص قاسم رکھا ہوگا۔ شعرائے اردو کے تذکروں میں قاسم تخلص والے سارے شاعروں کے متعلق جاننے کی کوشش کی اور سوچا کہ شاید اس طرح میر ابوالقاسم کا کوئی سراغ مل جائے گا۔ہم نے نساخؔ کے تذکرہ سخن شعراء کا مطالعہ کیا تو دیکھا کہ عبدالغفور نساخؔ نے اپنے تذکرہ 'سخن شعرا' میں ایسے نو شعراء کا ذکر کیا جو قاسم تخلص رکھتے تھے مثلاً آغا محمد قاسمؔ، قاسم علی خان قاسمؔ (باشندۂ فرخ آباد)، سید قاسم علی خان قاسمؔ (باشندۂ لکھنؤ)، قاسم علی قاسمؔ لکھنوی، شہزادہ ابوالقاسم قاسمؔ، قدرت اللہ قاسمؔ وغیرہ لیکن ان میں کوئی بھی میر ابوالقاسم خاںؔ نہیں ہے۔البتہ انہوں نے مشتاقؔ تخلص رکھنے والے جن نو شاعروں کا ذکر کیا ہے،ان میں ایک میر ابوالقاسم مرشد آبادی ہے۔نساخؔ نے اس شخص کا صرف نام لکھا ہے۔ اسکی زندگی کے حالات بیان کرنا تو درکنار، اس کے بارے میں وہ ایک جملہ تک نہیں لکھتے۔انہوں نے اس مشتاقؔ کے درج ذیل اشعار نمونہ کلام کے طور پر دیئے ہیں :

ہم ہی کرلیں گے جنوں کا سرو ساماں پیدا
کچھ تو وسعت کرے اے خضر بیاباں پیدا
دلِ خود بیں جو کرے دیدۂ پنہاں پیدا
آئینہ دیکھیں جو ہو صورتِ جاناں پیدا
کجروی سے نہیں ساقی کے عجب اے گردوں
گردشِ جام سے ہو گردشِ دوراں پیدا

نساخؔ کے **تذکرہ سخن شعراء** کے علاوہ مشتاقؔ تخلص رکھنے والے شاعروں کا ذکر درج ذیل تذکروں میں آتا ہے۔لیکن ان میں سے کوئی بھی میر ابو القاسم یا سید ابوالقاسم سبزواری نہیں ہے۔

تذکرہ شعرائے اردو از میر حسنؔ (۱۱۸۸ھ/۱۷۷۳ء) : اس میں صرف ایک مشتاقؔ کا ذکر ہے۔میر حسن مشتاقؔ۔ جو شاہجہاں آباد کے رہنے والے تھے۔

تذکرہ گلشن سخن از مردان علی خاں مبتلا لکھنوی (۱۱۹۵ھ) : یہ تذکرہ تین سو

اکیس شاعروں کے حالاتِ زندگی اور نمونہ کلام پر محیط ہے۔اس میں دو ہی مشتاقؔ ہیں۔

مشتاق میر حسن۔ دہلی کے رہنے والے تھے۔

مشتاق عظیم آبادیؔ۔ ہاشم قلی خاں کے بیٹے محمد قلی خاں مشتاقؔ۔

تذکرہ مسرت افزا از ابوالحسن امیر الدین امر اللہ آبادی (۱۱۹۵ھ)

اس میں محمد علی خاں مشتاقؔ اور مرزا ابراہیم بناری مشتاقؔ کا ذکر ملتا ہے۔

تذکرہ گلستانِ بے خزاں از میر قطب الدین باطنؔ (۱۲۹۱ھ)

اس میں تین مشتاقؔ ملتے ہیں۔

مشتاق تخلص عبداللہ نام۔مشتاق تخلص حافظ تاج الدین نام۔مشتاق تخلص محمد واصل نام۔

باطنؔ کے اس تذکرے میں تین قاسمؔ ہیں،لیکن وہ میر ابوالقاسم خاں یا سید ابوالقاسم سبزواری نہیں ہیں۔

تذکرہ گلشنِ بے خار از مصطفٰے خاں شیفتہؔ میں انہی تین مشتاقؔ کا ذکر ہے، جسے باطنؔ اپنے تذکرے میں درج کر چکے ہیں۔

تذکرہ روز روشن از مولوی محمد مظفر حسین صباؔ (۱۲۹۷ھ)

اس میں میر قاسمؔ یا مشتاقؔ کا کوئی ذکر نہیں۔

تذکرہ خوش معرکۂ زیبا از سعادت خاں ناصرؔ، تذکرہ گلِ رعنا از سید عبد الحئی میں بھی کسی قاسمؔ یا مشتاقؔ کا نشان نہیں ملتا۔

تذکرہ مخزن نکات از قائم چاندپوری میں 'مرزا ابوالقاسمؔ' تو ہے لیکن میر ابوالقاسم خاںؔ نہیں۔

ہم نے فورٹ ولیم کالج میں ترتیب پانے والے تذکرہ 'دیوانِ جہاں' کا قلمی نسخہ دیکھا۔اس امید پر کہ حسنِ اختلاط کا مصنف سید ابوالقاسم خاںؔ، 'دیوانِ جہاں' کے مصنف بینی نرائنؔ کا ہم عصر تھا، بہت ممکن ہے کہ بینی نرائنؔ نے اس کا ذکر اپنے تذکرے میں کیا ہو۔عام طور پر بینی نرائنؔ کے اس تذکرے کو محققین تذکرہ ماننے سے انکار کرتے ہیں۔ان کا خیال ہے کہ یہ تذکرہ نہیں بلکہ گلدستۂ اشعار ہے جس میں صرف شعراء کا کلام یکجا کر دیا گیا ہے۔حالانکہ تھامس روبک نے بینی نرائنؔ سے

تذکرہ کی ہی فرمائش کی تھی لیکن بینی نرائن نے غالباً زیادہ محنت کرنا ضروری نہیں سمجھا اور شعراء کی زندگی کے حالات جاننے کی کوئی کوشش نہیں کی۔ اکثر شعراء کا پورا نام تک نہیں جانتا، نہ ہی ان سے ملنے کی کوشش کر کے ان کے حالات دریافت کرتا ہے۔ بینی نرائن کے اس تذکرے یا گلدستے کی افادیت اس میں ہے کہ بنگال کی سرزمین سے تعلق رکھنے والے بہت سے شعراء کا نام اور ان کا کلام ہمیشہ کے لئے محفوظ ہو گیا ہے۔ بینی نرائن نے 'دیوانِ جہاں' (قلمی نسخہ نمبر ۵۶، ایشیا ٹک سوسائٹی آف بنگال) میں کسی ابوالقاسم خاں کا ذکر کیا ہے جن کا تخلص قاسم تھا۔ ق کے ذیل میں لکھتے ہیں :

"قاسم تخلص، نام ابوالقاسم خاں۔ خاندانِ بادشاہی سے کچھ قرابت رکھتے ہیں اور اس خاکسار کو بھی ان کی خدمت میں نیاز ہے۔ بالفعل کلکتے میں تشریف رکھتے ہیں۔" (قلمی نسخہ دیوانِ جہاں)

تذکرے کے خاتمے پر ان شعراء کا نام اور کلام بھی شامل ہے، جنہوں نے ۲۵ر جولائی کے مشاعرے میں طرحی غزلیں سنائی تھیں۔ اس میں بھی قاسم کا نام اور کلام شامل ہے۔ اس طرحی غزل کے دو اشعار اس بات کے گواہ ہیں کہ یہ قاسم دِلّی سے آیا ہے اور ان دنوں کلکتے میں مقیم ہے۔ دِلّی کی یاد اسے اسی طرح ستا رہی ہے جس طرح کہ میر کو لکھنؤ میں ستایا کرتی تھی۔

اب اذیت دہ ہے پورب کی ہوائے مختلف
یاں سے اسبابِ سکونت اب اٹھایا چاہئے
لگ رہی ہے لو یہی قاسم کئی دن سے ہمیں
حضرتِ دہلی کو کلکتے سے جایا چاہئے

نساخ نے قاسم تخلص رکھنے والے جن نو شعراء کا ذکر کیا ہے ان میں سے دو کلکتہ آئے تھے۔ اور وہ ہیں قاسم تخلص۔ قاسم علی لکھنوی۔ ۱۸۶۳ء میں کلکتہ میں تھے۔ انکی مثنوی حیرت افزا نظر سے گذری۔

قاسم تخلص۔ شہزادہ ابوالقاسم۔ اولاد میں امیر تیمور کی تھے۔ کلکتہ میں بھی آئے تھے۔

قاسم علی لکھنوی کو 'حسنِ اختلاط' کا مصنف ماننے میں ہمیں اس لئے قباحت ہے کہ قاسم مصنف 'حسنِ اختلاط' نے اپنے دیباچے میں گلکرسٹ سے ملاقات کا ذکر کرتے ہوئے بتایا ہے کہ تقریباً بیس برس پہلے ان کی اور گلکرسٹ کی ملاقات ہوئی تھی۔

اگر گلکرسٹ سے ملاقات کے وقت قاسم کی عمر بیس برس کی بھی ہوئی تو کتاب کی تصنیف کے وقت یعنی ۱۸۰۳ء میں وہ ۴۳ سال کے ہوں گے۔ ان میں مزید ۶۰ سال جوڑے جائیں تو ۱۰۳ سال کی عمر ہوتی ہے اور نساخ جس قاسم، مصنف مثنوی حیرت افزا کی بات کر رہے ہیں وہ ۱۸۶۳ء میں کلکتے میں مقیم تھا اور زندہ تھا۔

جہاں تک بات شہزادہ ابوالقاسم کی ہے، یہ وہ قاسم ہیں جن سے غالب کی بھی ملاقات رہی ہے اور جنہیں غالب نے 'یادگارِ درد' کہا ہے۔ اسی قاسم کا نام اور کلام 'دیوانِ جہاں' میں ملتا ہے۔ غالب جب ۱۸۲۸ء میں کلکتہ تشریف لائے تو انہی قاسم سے آپ کی قربت رہی۔ قاضی عبدالودود اس قاسم کے بارے میں معلومات فراہم کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ :

"غالب سے غالباً کلکتے کی ملاقات تھی۔ غالب کی مدحیہ غزل میں جس کا ذکر تپاں کے حال میں آیا ہے، ایک شعر ہے :

ہم سخن اور ہم زباں، حضرتِ قاسم اور تپاں
ایک تپش کا جانشیں، درد کا یادگار ایک

اگر درد کا یادگار سے یہ مراد ہے کہ درد کے بے واسطہ شاگرد تھے، تو غالب سے عمر میں بہت بڑے ہوں گے۔"[1]

اگر یہ 'حسنِ اختلاط' والے سید ابوالقاسم خاں ہیں تو یقیناً غالب سے بہت بڑے ہیں۔ قاسم سے گلکرسٹ کی ملاقات اس وقت ہوئی جب اس کے اردو لغات کا شہرہ پھیل چکا تھا۔ گلکرسٹ کے لغات کی پہلی جلد کلکتہ سے پہلی بار ۱۷۸۶ء میں شائع ہوئی تھی۔ غرض اس وقت اگر ہم قاسم کی عمر بیس سال فرض کر لیں تو اس کا سالِ پیدائش ۱۷۶۶ء ٹھہرتا ہے۔ اس اعتبار سے ۱۸۲۸ء میں قاسم کی عمر ۵۸ اور غالب کی ۳۲ سال تھی۔ قاضی عبدالودود لکھتے ہیں کہ :

"ایک قطعہ قاسم کا بھی غالب کی مدح میں ہے۔ مگر اس کا تعلق غالب کی شاعری سے نہیں۔ ظاہراً اسکے ساتھ جو خط بھیجا تھا اس میں یہ بھی تھا کہ کوئی غلطی ہو تو درست کریں۔ اور غالب نے اپنے منظوم جواب میں املے کی ایک غلطی کی طرف اشارہ بھی کیا تھا۔ ظاہراً قاسم، ہنری املاک کے متوسلین سے تھے۔"[2]

۱- مآثرِ غالب، مرتبہ قاضی عبدالودود، ادارۂ تحقیقاتِ اردو، پٹنہ، ۱۹۹۵ء، صفحہ ۵۳   ۲- ایضاً

قاسم کی وفات سے متعلق قاضی صاحب کا کہنا ہے کہ :

''غالب کے خطوں میں ان کی وفات کا ذکر نہیں۔ لیکن تپاں کی وفات کے کچھ دن بعد تک زندہ تھے۔ ان کے ایک لڑکے محمد مرزا کی وفات کی طرف بھی بعض خطوں میں اشارہ ہے۔ 'دل کشا' میں ان کا ذکر اس طرح ہے کہ گویا مر چکے ہیں۔ قرینہ ہے کہ تپاں کی وفات کے کچھ بعد راہی عدم ہوئے ہوں گے۔''[1]

قاضی عبدالودود اپنی کتاب مآثرِ غالب میں عبدالرؤف عروج کے حوالے سے لکھتے ہیں کہ بقول عروج بہادر شاہ ظفر کے روزنامچے سے معلوم ہوتا ہے کہ ابوالقاسم خاں کلکتہ سے دہلی آ کر وقائع نگار سلطانی ہو گئے (تھے) اور ہیضے کی وبا میں (وہیں) ۱۲ر دسمبر ۱۸۳۵ کو انتقال کیا۔ لیکن ڈاکٹر نادر علی خاں کے بیان سے معلوم ہوتا ہے کہ ۳۰ر جولائی ۱۸۴۱ء کو جب دہلی سے فارسی کا پہلا اخبار 'سراج الاخبار' جاری ہوا تو ابوالقاسم زندہ تھے۔ یہ اخبار مطبعِ سلطانی میں بہ اہتمام مصلح الدولہ سید ابو القاسم خاں وقائع نگار و امداد علی بیگ خاں چھپ کر شائع ہوتا تھا۔ (اردو صحافت کی تاریخ، صفحہ: ۱۳۴) اس بیان سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ مرزا نسباً سید تھے۔ عروج نے بھی ان کا پورا نام مع خطاب مصلح الدولہ سید ابوالقاسم خاں ہی لکھا ہے۔ ان ساری تفصیلات کے پیشِ نظر ہمیں سید ابو القاسم خاں یا سید ابوالقاسم خاں سبزواری یا میر ابوالقاسم خاں کو ایک ہی شخص اور 'حسنِ اختلاط' کا مصنف ماننے میں کوئی تامل نہ ہونا چاہئے۔

اگر تذکرہ نگاروں نے شعرائے اردو کا تذکرہ لکھتے وقت تھوڑی سی محنت کی ہوتی اور شاعر کے حالات بتانے میں کشادہ دلی کا مظاہرہ کیا ہوتا تو آج ہمیں قاسم کی تلاش میں یوں بھٹکنا نہ پڑتا۔ ابوالقاسم کے بارے میں تذکرہ نگاروں کی بے حسی اور اس کے نثری کارنامے سے انحراف ان کی ناواقفیت کی دلیل ہے۔ ہوسکتا ہے کہ ابوالقاسم ایک عزلت پسند شخص ہو اور مشاعروں میں شرکت نہ کرتا ہو ورنہ کیا وجہ ہے کہ اسی دور میں تذکرہ مسرت افزا کا مصنف بنگال آتا ہے تاکہ یہاں کے شاعروں سے بہ نفسِ نفیس ملکر ان کے حالات جان سکے اور اپنے تذکرے میں حقیقت کا رنگ بھر سکے لیکن اس کے تذکرے میں بھی کسی ابوالقاسم خاں کا کوئی ذکر نہیں۔ اس تذکرے کے مرتب کا کہنا ہے کہ :

۱۔ مآثرِ غالب، مرتبہ قاضی عبدالودود، ادارۂ تحقیقات اردو، پٹنہ، ۱۹۹۵ء، صفحہ: ۵۳

''مؤلف نے زیادہ تر تفصیل سے کام لے کر شعرا کے حالات لکھے ہیں اور ایسے شعراء کی تعداد بکثرت ہے جن سے وہ براہ راست ملا تھا۔ ذاتی واقفیت کی بنا پر اس کی اطلاع معتبر سمجھی جائے گی...... اس تذکرے کی داغ بیل اس نے ۱۱۹۲ھ یا اس سے کچھ قبل ہی ڈال دی ہو تو عجب نہیں۔ دورانِ سفر عظیم آباد، مرشد آباد، کلکتہ، بنارس وغیرہ جہاں جہاں وہ گیا، تذکرہ کے لئے مواد جمع کرتا رہا۔''[1]

میر ابو القاسم خاں اور گلکرسٹ

میر ابوالقاسم خاں کا نام بحیثیت مصنف پہلے پہل اس فہرست میں نظر آتا ہے، جسے جان گلکرسٹ نے کالج کونسل کو اس امید کے ساتھ پیش کی تھی کہ اس کی سفارشات پر غور کرتے ہوئے کالج کونسل ان کتابوں کو انعام سے نوازے گا جو اس نے بڑی محنت اور توجہ کے ساتھ اپنی نگرانی میں اس لئے تیار کروائی ہیں کہ انگریز افسران کو اردو سیکھنے میں آسانی ہو سکے۔ گلکرسٹ نے پہلی بار یہ فہرست ۱۹ر اگست ۱۸۰۳ء میں پیش کی۔ اس میں 'حسنِ اختلاط' مطبوعہ کتابوں کی فہرست میں شامل تھی حالانکہ اب اسکی ایک بھی مطبوعہ کاپی دستیاب نہیں ہے۔ بہر حال، گلکرسٹ نے اس کتاب پر پچاس روپے کا انعام دینے کی سفارش کی تھی۔ تاہم اس کی سفارش منظور نہ ہوسکی۔ اس نے تھوڑی سی ترمیم اور اضافے کے ساتھ یہ فہرست دوبارہ کالج کونسل کی خدمت میں پیش کیا اور میر ابوالقاسم کے تعلق سے لکھا کہ :

"A native gentleman in Calcutta who has written the miscellaneous work with great spirit rather as a specimen of what we may expect from him........"

محمد عتیق صدیقی نے 'جینٹلمین' کا ترجمہ 'بزرگ' (گلکرسٹ اور اسکا عہد، صفحہ: ۱۴۸) کیا ہے جو میرے نزدیک مناسب نہیں۔ لفظ 'بزرگ' سے ہمارے ذہن میں کسی ایسے شخص کا تصور ابھرتا ہے، جو عمر کی بیشتر منزلیں طے کرچکا ہے جبکہ ابوالقاسم کے اشعار سے پتہ چلتا ہے کہ فوج کا افسر گارڈن اس کا دوست ہوا کرتا تھا۔ اسی کے گھر پر قاسم کی گلکرسٹ اور مسٹر کرسپ سے ملاقات ہوئی تھی اور وہ گلکرسٹ کی زبان دانی سے از حد متاثر ہوا تھا۔ قاسم نے 'حسنِ اختلاط' میں لکھا ہے کہ :

۱۔ عرض مرتب، تذکرۂ مسرت افزا، تلخیص و ترجمہ عطا کاکوی، پٹنہ، ۱۹۶۸ء، صفحہ: ۳۲

کہ نام اس کا تھا گارڈن فوج میں
شب و روز رہتا تھا وہ موج میں
پہ تھی دوستی مجھ کو ون سے قدیم
کہ رہتا تھا اکثر جلیس و ندیم
پکڑ ہاتھ میرا بدستور خویش
کیا مہربانی کو از پیش بیش
غرض لے گیا اپنے گھر میں بلا
بٹھا کر کیا حاضری کی صلہ

ابوالقاسم کی باتوں سے پتہ چلتا ہے کہ اسکی اور گلکرسٹ کی ملاقات 'حسنِ اختلاط' کی تصنیف سے تقریباً بائیس برس پہلے ہوئی تھی۔ 'حسنِ اختلاط' کے خاتمے پر سالِ تصنیف ۱۸۰۳ء درج ہے جبکہ جاوید نہال پتہ نہیں کیوں ۱۸۰۰ء بتاتے ہیں۔ وہ لکھتے ہیں کہ :

''اس کی (حسنِ اختلاط) اہمیت اس لئے ہے کہ اردو نثر نگاری کا یہ ایک بہت ہی قدیم نمونہ ہے اور فورٹ ولیم کالج کی داستانوں اور تاریخوں کی تالیف سے پہلے جنوری ۱۸۰۰ء میں ترتیب پا چکی تھی۔ سید صاحب کی یہ تاریخ بھی شرمندۂ اشاعت نہ ہو سکی اور صرف مخطوطہ کی شکل میں کلکتہ میں محفوظ ہے''۔[۱]

یہاں ان کا یہ کہنا کہ 'سید صاحب کی یہ تاریخ بھی شرمندۂ اشاعت نہ ہو سکی' کئی طرح کی غلط فہمیوں کو راہ دیتا ہے۔ 'بھی' کا لفظ یہ احساس دلاتا ہے کہ 'حسنِ اختلاط' کے علاوہ بھی کچھ اور کتابیں یا تاریخیں تھیں جو شائع نہ ہو سکی۔ حالانکہ خود حسنِ اختلاط کو بھی غیر مطبوعہ نہیں کہا جا سکتا کیونکہ اگر یہ غیر مطبوعہ ہوتی تو انعام کے لئے سفارش کی گئی کتابوں کی فہرست میں کیوں ہوتی :

ایشیاٹک سوسائٹی میں موجود 'حسنِ اختلاط' کے نسخے کے بموجب ابوالقاسم کی یہ تصنیف اٹھارہ سو تین سال انگریزی چوتھی مئی بدھ کے دن کلکتہ میں انجام کو پہنچی۔ وہ لکھتا ہے:

''مارکوئس ولزلی بہادر گورنر کے عہد میں یہ کہانی موسوم بہ 'حسنِ اختلاط' اٹھارہ سو تین سال انگریزی چوتھی مئی بدھ کے دن چشمِ بد دور کلکتہ میں حسنِ انجام کو

۱۔ انیسویں صدی میں بنگال کا اردو ادب، ڈاکٹر جاوید نہال، صفحہ: ۲۰۹

پہونچی۔ الخبر فما وقع۔'' (قلمی نسخہ، حسنِ اختلاط)

اسی مخطوطے میں وہ اپنی اور انگریز افسروں کی دوستی بیان کرتے ہوئے لکھتا ہے کہ :

یہ شاید برس بیس کی بات ہے
پہ وہ سب مجھے یاد دن رات ہے
کہ اک دن جو تڑکے میں باہر گیا
سرِراہ مجھ کو اک افسر ملا
کہ نام اس کا تھا گارڈن فوج میں
شب و روز رہتا تھا وہ موج میں

بعد کے اشعار بتاتے ہیں کہ گارڈن ابوالقاسم خاں کو اپنے ساتھ اپنے گھر لے جاتا ہے۔ وہاں قاسم کی ملاقات کرسپ نامی اک شخص سے ہوتی ہے۔ ابھی وہ تینوں خورد و نوش میں مصروف تھے کہ ایک چوتھا شخص وہاں گارڈن سے ملنے آ پہنچتا ہے۔ یہ چوتھا شخص گلکرسٹ ہے۔

ابوالقاسم کی باتوں سے پتہ چلتا ہے کہ وہ اس وقت تک گلکرسٹ کے نام سے واقف نہ تھا اور نہ ہی اسے یہ علم تھا کہ گلکرسٹ کو اردو یا ہندوستانی زبان میں مہارت حاصل ہے۔ وہ اس مغالطے میں مبتلا تھا کہ ہندی/ اردو میں مہارت حاصل کرنے کے لئے کسی شخص کا ہندوستانی ہونا ضروری ہے :

مگر یہ جو ہندی کی ہے بول چال
حصول اس کا تک غیر کو ہے محال
تعلم سے ہوں علم حاصل تو سب
مگر گفتگو ہند کی ہے کو ڈھب
نہ ہو بولنے کی مہارت تمام
کسی طرح سیکھے رہے گا وہ خام
کرے غیر گر عمر کو صرف یاں
نہ ہووے وہ ہندی میں کامل زباں

مگر گلکرسٹ سے ملتے ہی اسے اندازہ ہوتا ہے کہ اس کی سوچ کتنی غلط تھی۔ گلکرسٹ کی زبان دانی اسے حیرت میں ڈال دیتی ہے :

زباں ان نے کھولی جو ہندی میں آ
بڑا دل یہ کہتا تھا اے مرحبا
فصاحت کا اس کی جو کیجے بیاں
تو ہووے قلم یاں قلم کی زباں

گویا جب قاسم اور گلکرسٹ کی ملاقات ہوئی تو اس وقت گلکرسٹ اردو/ ہندی میں مہارت حاصل کر چکا تھا۔ غالباً گارڈن کے یہاں ہی قاسم کو پتہ چلا ہوگا کہ گلکرسٹ نے اردو زبان کا قاعدہ ترتیب دیا ہے جس سے ایک عالم فیض یاب ہوا ہے :

کیا لفظ و حرفوں کا وہ قاعدہ
کہ عالم کو جس سے ہوا فائدہ
غرض ہے گا وہ ایک صاحب کمال
بجا ہے جو کہئے عدیم المثال

یہ پہلے بھی لکھا جا چکا ہے کہ گلکرسٹ کے قواعد کی پہلی جلد ۱۷۸۶ء میں منظر عام پر آئی تھی۔ ہوسکتا ہے کہ ابوالقاسم سے گلکرسٹ کی ملاقات ۱۷۸۶ء کے بعد ہوئی ہو۔ اس اعتبار سے 'حسنِ اختلاط' کی تصنیف ان کی ملاقات کے تقریباً سترہ سال بعد ہوئی ہے۔ بہر حال، اتنا تو طے ہے کہ جب قاسم سے گلکرسٹ کی ملاقات ہوئی تو اس وقت تک گلکرسٹ، ہندوستانی زبان میں مہارت حاصل کر چکا تھا۔

میر ابوالقاسم خاں سبزواری کے متعلق کوئی رائے قائم کرنے کیلئے ہمیں اس کی تحریر سے ہی استفادہ کرنا پڑتا ہے۔ 'حسنِ اختلاط' کا یہ مصنف زبان و بیان سے قطعی ناواقف تھا، ایسا ہم نہیں کہہ سکتے۔ وہ نثر نگار بھی تھا اور شاعر بھی۔ کول بروک نے جن دو دیسی ممتحنوں کو اس کی تصنیف کا جائزہ لینے کی ذمہ داری بخشی تھی، انہوں نے اس کی 'کم علمی' کے بہانے 'حسنِ اختلاط' کو انعام کے ناقابل قرار دیا اور اس طرح یہ کتاب انعام پانے سے رہ گئی۔ حالاں کہ 'حسنِ اختلاط' کے ساتھ ساتھ چند

اور کتابوں کے بارے میں بھی مبصرین کی رائے کوئی بہت اچھی نہ تھی، تاہم وہ کتابیں رد و کد کے بعد انعام سے نواز دی جاتی ہیں۔ مثلاً 'گلِ ہرمز' کے سلسلے میں مبصرین کچھ اس طرح اپنی رائے پیش کرتے ہیں :

"زبان گرچہ صحیح نہیں ہے لیکن موضوع سے مطابقت ضرور رکھتی ہے۔ انعام بہر حال گلکرسٹ کی تجویز کے مطابق دیا جا سکتا ہے۔"

(گلکرسٹ اور اسکا عہد، صفحہ:۱۵۳)

اور 'گل بکاؤلی' کے بارے میں کہتے ہیں کہ :

"زبان اور طرز بیان دونوں غلط ہیں۔ لیکن مصنف کچھ ہمت افزائی کا مستحق بھی معلوم ہوتا ہے۔ مسٹر گلکرسٹ نے ڈیڑھ سو روپے کا انعام تجویز کیا ہے جو گھٹا کر سو کیا جاتا ہے۔" (گلکرسٹ اور اسکا عہد، صفحہ:۱۵۳)

'فیروز شاہ یا شہر بدخشاں' کے بارے میں ان ممتحنوں کا کہنا تھا کہ :

"نہ تو زبان ہی صحیح ہے نہ طرز بیان ہی اچھا ہے۔ بہر کیف کچھ ہمت افزائی کی جا سکتی ہے۔ گلکرسٹ کے مجوزہ پچاس روپے کے انعام میں مشکل سے ہی کمی کی گنجائش نکل سکتی ہے۔" (گلکرسٹ اور اسکا عہد، صفحہ:۱۵۳)

غرض حاجی مرزا مغل (بوستان کا ترجمہ)، کندن لال (کام کلا)، غلام حیدر (گلِ ہرمز)، نہال چند (گلِ بکاؤلی) اور محمد بخش (فیروز شاہ) وہ خوش نصیب ہیں جو انعام کے حقدار ٹھہرتے ہیں۔ جنہیں انعام سے محروم رکھا جاتا ہے، وہ ہیں نور خاں (گلِ صنوبر)، تو تا رام (دل ربا) اور میر ابوالقاسم خاں (حسنِ اختلاط)۔

تاہم ششر کمار داس ان آٹھوں کتابوں کو انعام پانے والی کتابوں کی فہرست میں جگہ دیتا ہے۔ اور Home Miscellaneous.559., pp 242-3, & pp 285-6 کے حوالے سے اپنی بات کہتا ہے۔ (Sahibs and Munshis., p 115)

●●●

حسنِ اختلاط کا تنقیدی جائزہ

'حسنِ اختلاط' میر ابوالقاسم خاںؔ کی تصنیف ہے۔ زیرِ نظر نسخہ کلکتہ کی ایشیاٹک سوسائٹی میں محفوظ ہے۔ اس نسخے کے سرورق پر لکھا ہے 'حسنِ اختلاط۔ نثر بزبانِ ہندی'۔ اندر کے صفحے پر فورٹ ولیم کالج کی مہر لگی ہے۔ کتاب کے ایک کونے پر 'اختلاطِ ہند' انگریزی اور اردو، دونوں زبانوں میں لکھا ہے۔ کتاب کی قیمت ۴ر لکھی ہے نیز قیمت انگریزی میں درج ہے۔ کتاب کے پہلے صفحے پر انگریزی میں 'کالج آف فورٹ ولیم' لکھا ہے۔ اس کے بعد صفحے کے وسط سے کتاب شروع ہوتی ہے۔ 'ہوالعزیز' اور 'بسم اللہ الرحمٰن الرحیم' کے بعد اصل قصے کا آغاز ہوتا ہے۔ پہلے صفحے پر چار سطریں درج ہیں۔ بعد کے صفحات پر کہیں نو اور کہیں گیارہ ہیں۔ آخری صفحے پر دو سطریں ہیں۔ نسخے میں کل تیس ورق ہیں۔ نسخے کا سائز 16 x 23 ہے۔ کاغذ ہاتھ کا بنا ہے۔ نسخہ خطِ نستعلیق میں ہے۔ کچھ حد تک کرم خوردہ ہے۔ نسخے پر بدھ ۴ر مئی ۱۸۰۳ء کی تاریخ درج ہے۔ ایشیاٹک سوسائٹی کی فہرستِ مخطوطات کے مطابق اس کا نمبر اردو سوسائٹی کلیکشن ۱۱۴ ہے۔ غالباً اس نسخے کو مصنف میر ابوالقاسم خاںؔ نے فورٹ ولیم کالج کو بطورِ تحفہ پیش کیا تھا، اس لئے انگریزی میں یہ جملہ بھی ملتا ہے۔

A gift from the author Mir Abool Qasim Khan

اس کتاب کا ایک نسخہ کتب خانۂ آصفیہ اور کتب خانہ نواب سالار جنگ میں بھی موجود ہے۔ کتب خانہ سالار جنگ میں اس نسخے کا کیٹلاگ نمبر ۱۰۰۷ ہے۔ اور مخطوطہ نمبر ۱۳۔ نصیر الدین ہاشمی کی پیش کردہ تفصیلات کے مطابق خطِ نستعلیق میں لکھا گیا ہے۔ سائز ۱۴x۲/۸۱ ہے۔ کاغذ ولایتی اور صفحات ۱۹ ہیں۔ مصنف کا نام سید ابوالقاسم سبزواریؔ ہے۔ کتاب ۱۲۱۸ھ مطابق ۱۸۰۳ء میں تصنیف ہوئی۔ اس نسخے کی کتابت ۱۲۲۴ھ میں ہوئی۔ ہر صفحے پر اکیس سطریں ہیں۔

ایشیاٹک سوسائٹی اور کتب خانہ سالار جنگ کے نسخوں میں تاریخِ تصنیف ۱۸۰۳ء ہی ہے۔ نصیر الدین ہاشمی اسے تاریخ کی فہرست میں نہیں رکھتے بلکہ ان کی رائے ہے کہ :

''حالات کو بطرزِ افسانہ لکھا ہے۔''[1]

اس کتاب کو لکشمی ساگر وارشنے 'انواؤ' (ترجمہ) بتاتے ہیں لیکن یہ کس کتاب کا ترجمہ ہے، یہ نہیں لکھتے۔ عتیق صدیقی کے مطابق :

''یہ کوئی مکمل کتاب نہیں ہے بلکہ ایک متفرق تالیف ہے۔''[2]

ڈاکٹر سمیع اللہ اسے 'تاریخی' کتاب کہتے ہیں۔ (فورٹ ولیم کالج: ایک مطالعہ، صفحہ: ۱۷۷)

'حسنِ اختلاط' کے بارے میں خود مصنف میر ابوالقاسم خاںؔ نے کہیں یہ اطلاع نہیں دی ہے کہ یہ کسی کتاب کا ترجمہ ہے۔ کتاب کے شروع میں ہی مصنف اس کتاب کی جو وجہ تالیف بیان کرتا ہے، اس سے سمجھ میں آتا ہے کہ یہ کتاب اس نے اپنے دل سے باتیں کرنے کے بعد لکھی ہے:

''کہ مسافر جو آپس میں باتیں کرتے ہوئے جاتے ہیں تو راہ خوب کٹتی ہے۔
پھر اس سے کیا بہتر ہے کہ کوئی قصہ یا حکایت یا کہانی بات ایسی کہتے چلو کہ جس
سے راہ کٹے اور ماندگی مٹے۔'' (قلمی نسخہ حسن اختلاط)

عتیق صدیقی اسے مکمل کتاب ماننے سے انکار کرتے ہیں۔ اگر وہ بھی اسے تاریخ کی کتاب مانتے ہوئے تسلسل تلاش کر رہے ہوں گے تو یقیناً انہیں مایوسی ہوئی ہوگی۔

سمیع اللہ اسے تاریخ کی کتاب مانتے ہیں۔ حالانکہ واقعاتی غلطیاں سرزد ہونے کے ڈر سے قاسمؔ نے شروع ہی میں اس کے تاریخی ہونے سے انکار کر کے اپنا دامن بچا لیا ہے۔ وہ لکھتا ہے کہ:

''جبکہ ہمیں احوال ہی سے کچھ کام نہ ہو پھر غلطی کس کا نام ہے کہ ہم اسے ڈھونڈھیں

۱- کتب خانہ نواب سالار جنگ مرحوم کی اردو کتابوں کی وضاحتی فہرست، مرتبہ نصیر الدین ہاشمی، مطبع ابراہیمیہ، حیدر آباد، ۱۹۵۷ء

۲- گلکرسٹ اور اس کا عہد، محمد عتیق صدیقی، صفحہ: ۱۵۳

صرف لطفِ اختلاط اور حسنِ تقریر کے ہم تو بندے ہیں۔''

غرض اگر قاسم کی بات کا بھروسہ کریں تو ہم کہہ سکتے ہیں کہ حسنِ اختلاط نہ تو ترجمہ ہے اور نہ تاریخ۔ یہ دل بہلانے کے لئے لکھی گئی ایک کتاب ہے جس میں تاریخی واقعات در آئے ہیں۔ میر ابوالقاسم نے پتہ نہیں کس نیت سے اس میں سراج الدولہ کا ذکر خاصے نازیبا انداز میں کیا ہے۔ سراج الدولہ کے خاندان کا بیان دیکھتے ہوئے ہی غالباً اسٹیٹ سنٹرل لائبریری، حیدر آباد کے مرتب فہرستِ مخطوطات نے اسے مرشدآباد کی تباہی کی مختصر تاریخ کا نام دیا ہے۔ عبیدہ بیگم لکھتی ہیں:

''مرتب فہرستِ مخطوطات، اسٹیٹ سینٹرل لائبریری حیدر آباد نے حسنِ اختلاط کو مرشدآباد کی تباہی کی مختصر تاریخ کہا ہے جس میں وہاں کی تباہی کا حال اور چشم دید واقعات کو بطور افسانہ لکھا گیا ہے۔''[1]

بہر حال خود مصنف ابوالقاسم خاں اور دوسرے ادب نوازوں کی بات کو دھیان میں رکھیں تو ہم کہہ سکتے ہیں کہ 'حسنِ اختلاط' دراصل ایک نیم تاریخی کتاب ہے، جسے میر ابوالقاسم خاں نے اس لئے لکھا تھا کہ (۱) وہ لطفِ اختلاط چاہتے تھے (۲) انہیں حسنِ تقریر کا اظہار مقصود تھا (۳) وہ زبانِ ہندی میں اپنی مہارت ثابت کرنا چاہتے تھے (۴) وہ گلکرسٹ کی ادب نوازی کے قائل ہو چکے تھے اور خود کو گلکرسٹ کے دوستوں میں شامل دیکھنا چاہتے تھے (۵) وہ فورٹ ولیم کالج کے دوسرے منشیوں کی طرح انگریزوں کی خوشامد اور چاپلوسی کر کے اربابِ اقتدار کے قریب ہونا چاہتے تھے۔ غالباً اسی مقصد کے تحت انہوں نے انگریزوں کے بدترین دشمن سراج الدولہ کی برائیاں بیان کر کے انگریزوں کی خوشنودی حاصل کرنا چاہی۔ (۶) انکا مقصد مرشدآباد میں پیش آنے والے واقعات اور سراج الدولہ کی شکست کو بیان کر کے ہندوستانیوں کو انگریزوں کی بغاوت سے باز رکھنا تھا (۷) تاریخی واقعات کے حوالے سے خانہ جنگی کے مضر اثرات کی نشاندہی کرنا چاہتے تھے (۸) تاریخ کی کتاب لکھنے کا ارادہ رکھتے تھے لیکن یا تو ناقص معلومات کی بنا پر یا اصل واقعہ بیان کرنے کی جرات نہ ہونے کی وجہ سے 'حسنِ اختلاط' اور 'لطفِ اظہار' کو اصل مدعا بتا کر 'تاریخ جیسی' کوئی چیز لکھ دی تاکہ استفسار سے بچ جائیں۔ اس لئے گلکرسٹ نے بھی اسے miscellaneous کے طور پر دیکھا اور اسے کسی مکمل کتاب کے بجائے اصل کتاب کا 'نمونہ' کہا۔ جب اسے انعام دینے سے

۱- عبیدہ بیگم، فورٹ ولیم کالج کی ادبی خدمات، نصرت پبلشرز، لکھنؤ، ۱۹۸۳ء، صفحہ: ۵۹۱

پیشتر اس کی قدر و قیمت متعین کرنے کے لئے دو 'دیسی ممتحنوں' سے ان کی رائے مانگی گئی تو انہوں نے اسے مصنف کی ناقص معلومات اور ناپختہ اسلوب کی وجہ سے انعام کے ناقابل قرار دیا۔

اصل قصہ

اصل قصہ شروع کرنے سے پہلے مصنف یہ بتا دیتا ہے کہ وہ سچے واقعات پر مبنی کہانی لکھنے کا کوئی ارادہ نہیں رکھتا۔ اس کا مقصد فقط حسنِ اختلاط اور لطفِ اظہار ہے۔ اس کا دل اس سے کہتا ہے کہ کوئی ایسی کہانی کہو کہ جسے سنتے سنتے راہ کٹ جائے اور سفر آسان ہو جائے۔ اپنے دل کی بات سن کر وہ کہانی کہنے پر آمادہ ہوتا ہے اور ابتدا میں ہی گلکرسٹ کا نام لئے بغیر اس کی شان میں قصیدے پڑھنے لگتا ہے کہ کسی مردِ کامل نے 'دلّی کی اردو زبان کو صرف و نحو کے قاعدہ کے سانچے میں ڈھال کر علم بنا کر کھڑا کر دیا ہے اور اس رتبہ پر پہنچا دیا ہے کہ جن کی وہ زبان تھی انکو جلی لگ گئی'۔

اس شخص نے نہ صرف اس زبان کو قاعدے میں ڈھالا بلکہ دور دور سے اچھے، قابل، لائق، اشراف اور نجیب لوگوں کو منگوا کر اپنا رفیق کیا ہے اور اہلِ علم کی ایسی قدر دانی کی ہے کہ سبھوں کو علم حاصل کرنے اور ادب تحریر کرنے کی رغبت ہو رہی ہے۔ اس لئے میر ابوالقاسم بھی بنا کچھ بولے رہ نہ پائے اور انہوں نے یہ کتاب لکھ ڈالی۔

اس کے بعد قاسم ایک نظم کے ذریعہ اپنی اور گلکرسٹ کی ملاقات کا حال بیان کرتے ہیں اور بعد ازاں اصل قصے کی طرف آتے ہیں۔

قصے کی شروعات احوالِ ہند کے بیان سے کرتے ہیں جو انتہائی مختصر ہے۔ دو چار صفحوں میں ہی ہستنا نگر، راجہ وکرمادتیہ اور اس کے بھائی سک آدھت، ان کی سلطنت کے زوال، پٹھانوں اور تورانیوں کے عروج و زوال سے نپٹ لیتے ہیں اور بنگالے تک جا پہنچتے ہیں۔ نواب جعفر خاں، حاجی احمد، مرزا بندے کا ذکر کرتے ہوئے سرفراز خاں تک پہنچتے ہیں اور اس کے بعد مہابت جنگ اور ہیبت جنگ سے ہوتے ہوئے سراج الدولہ تک۔ سراج الدولہ کو لعن طعن کر کے، بیسنتکو کے گن گاتے ہوئے قصہ اختتام کو پہنچتا ہے۔

انداز بیان

'حسنِ اختلاط' کی نثر فورٹ ولیم کالج کی نثر سے کوئی بہت زیادہ مختلف نہیں۔ یہ کتاب ایک

ایسے دور میں لکھی گئی، جب بنگال میں اردو نثر کی شروعات ہوئی اور وہ بھی ایک مخصوص نظریے کے تحت یعنی نثر نگار کو یہ بات مدِ نظر رکھنی تھی کہ وہ ایسے لوگوں کے لئے یہ کتاب لکھ رہا ہے جو اردو سے ناواقف ہیں اور جنھیں ان کتابوں کے ذریعہ ہی اردو میں مہارت حاصل کرنی ہے اور وہ بھی اس لئے کہ ملازموں اور زیردستوں سے بات چیت کی جا سکی۔ اس مقصد کے لئے ضروری تھا کہ روزمرہ کی گفتگو میں پیش آنے والے محاورات کو پوری طرح برتا جائے اور ضرب الامثال وغیرہ کا استعمال بھی فطری انداز میں دکھایا جائے۔

میر ابوالقاسم خاںؔ نے جب یہ کتاب لکھی تو اس وقت اردو نثر کی دنیا میں وہ بھی فورٹ ولیم کالج کے دوسرے نثر نگاروں کی طرح نووارد تھے۔ ان کے سامنے بھی اردو نثر کے نمونے موجود نہیں تھے اور اگر کچھ رہیں بھی ہوں گے تو وہ ہوں گے صوفیائے کرام کے ملفوظات، رسالے یا پھر یوروپی مصنفین کے قواعد یا صرف ونحو کی کتابیں۔ ان حالات کے پیش نظر ہم ابوالقاسم خاں کی لسانی لغزشوں کو نظر انداز کرنے کا ارادہ نہیں رکھتے لیکن ان کی غلطیوں کو ناقابلِ معافی بھی نہیں کہہ سکتے۔

قاسم ایسی کتاب تصنیف کرنے کا ارادہ رکھتے تھے جس سے گفتگو کا لطف ظاہر ہو۔ غالباً اس لئے انھوں نے بامحاورہ زبان استعمال کی۔ جگہ بہ جگہ اردو اور فارسی کے ضرب الامثال کا بھی التزام رکھا۔ کہیں کہیں یہ غیر ضروری معلوم ہوتے ہیں لیکن شاید قاسمؔ یہ بتانا چاہتے تھے کہ اردو زبان سیکھنے کے دوران ایسے ضرب الامثال اور محاوروں کا استعمال بھی سیکھنا چاہئے۔ تیس صفحوں کے اس نسخے میں قاسمؔ نے محاوروں کا بے دھڑک استعمال کیا ہے۔ متضاد الفاظ بھی آئے ہیں۔ عربی اور فارسی کے ضرب الامثال کے ساتھ ساتھ اشعار بھی شامل کئے گئے ہیں۔ ذیل کی فہرست سے اس کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔

محاورات

کمر باندھنا۔ ہاتھ اٹھانا۔ گریباں میں منہ ڈالنا۔ منہ پکڑنا۔ راہ پکڑنا۔ راہ کھوٹی کرنا۔ شلکیں بھرنا۔ راہ کٹنا۔ گلے کا ہار ہونا۔ موج مارنا۔ زبان سنبھالنا۔ جی چھڑانا۔ کان دھرنا۔ زبان کھولنا۔ عبرت پکڑنا۔ نقش بٹھانا۔ کان کھڑے کرنا۔ تسلط پکڑنا۔ خجالت کھینچنا۔ پلک مارنا۔ پو پھٹنا۔ ہول کھانا۔ مطلع صاف ہونا۔ نذریں لینا۔ ہاتھ پڑنا۔ ناک میں دم آنا۔ کنارہ پکڑنا۔ بات ٹالنا۔ مزاج

پھیرنا۔ خاطر میں لانا۔ بات بگڑنا۔ انتظام پکڑنا۔ ہاتھ ڈالنا۔ دل سے اترنا۔ نظروں سے گرنا۔ دن بھرنا۔ یقین بندھنا۔ گھر کرنا۔ نہال ہونا۔ حرف مٹنا۔ نکتہ پھلنا۔ کلمہ پڑھنا۔ پر جلنا۔ چھٹی کا دودھ یاد آنا۔ پھولا نہ سمانا۔ ٹکی لگانا۔

ضرب الامثال

ملا کی دوڑ مسجد۔ سور ما چنا بھاڑ نہیں پھوڑ سکتا۔ جن نے ببول بوئے وہ آم کہاں سے کھائے گا۔ منہ لگائی ڈومنی ناچے تال بیتال۔ نادان بات کہے اور دانا قیاس کرے۔ سر منڈاتے ہی اولے پڑے۔ ہر کرا پنج روز نوبت است۔ چوں گوش روزہ دار بر اللہ اکبر است۔

متضاد الفاظ

چھوٹے بڑے، ادنیٰ۔ اعلیٰ، امیر۔ فقیر، مسافر۔ مقیم، محتاج۔ غنی

قاسمؔ 'ان' کو 'ون' لکھتے ہیں۔ 'ہے گا' اور 'ہے گی' کا استعمال عام ہے۔

جمع الجمع کی بھی مثالیں ملتی ہیں۔ مثلاً سلاطینوں۔

مرکب الفاظ مثلاً نفیر و قطمیر، رطن و فتق، ضبط و ربط، چال ڈھال، طرح ترکیب، بند و بست۔ ہندی کے الفاظ بھی آئے ہیں۔ مثلاً کچلک، مہاجن، کدانا، راکس، مانس گندھ، پتال (پاتال)، پلا (ترازو)، وغیرہ۔

قاسمؔ نے جابجا مخاطب کرنے کے لئے 'اجی' اور 'جی' کا استعمال کیا ہے۔ فورٹ ولیم کالج سے متعلق یا غیر متعلق دوسرے مصنفین کے یہاں یہ خصوصیت نہیں پائی جاتی۔

'حسنِ اختلاط' ادبی فن پارے کے اعتبار سے قابلِ ستائش ہو یا نہ ہو، اس اعتبار سے سراہے جانے کے لائق ضرور ہے کہ ترجمے کے دور میں یہ طبع زاد تصنیف ہے۔

●●●

حسنِ اختلاط

ہوالعزیز

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

کیوں جی۔تم نے بھی اس کی حمد پر کمر باندھی ہے کہ جس کی کنہ ذات کی دریافت میں پیغمبر عاجز ہیں۔خدا کے واسطے ذرا ادھر تو دیکھو لوکہ ادراکِ محمدی یہاں کس درجے پر قاصر ہے کہ وہ یہ فرماتا ہے ماعرفناک حق معرفتک یعنی میں نہ سمجھا وہ کہ جو حق ہے۔سمجھے گا جل جلالہٗ اور سارے محقق بھی یہی کہتے چلے گئے ہیں

توان در بلاغت بسحباں رسید   نہ در کنہ بیچوں سبحاں رسید

غرض اب بھی سمجھوتو وہ مثل ہے کہ صبح کا بھولا اگر شام کو آوے تو اسے بھولا نہیں کہتے۔اب تو آؤ۔جانے دو۔اس فضولی سے ہاتھ اٹھاؤ۔برمحمد صلوات۔اور اس سے آگے اگر نعت کا ارادہ رکھتے ہوتو اپنے گریباں میں منہ ڈال کر اس شعر کو پڑھ لو بلکہ اسی پر ختم کرو۔

چہ نعت پسندیدہ گویم ترا   علیک الصلوۃ اے نبی الورا

پھر آگے جا ہو سو کہو۔کوئی تمہارا منہ نہیں پکڑتا۔مگر رسم یوں چلا آیا ہے کہ بھاری پتھر کو چوم کے چھوڑ دیتے ہیں۔پھر اگر کچھ بھی عقل سے بہرا رکھتے ہوتو چپکے اپنے مطلب کی راہ پکڑو۔اور سیدھے

چلے جاؤ ادھر کو کہ جدھر کا قصد ہے تمہیں اور اگر اب اٹکتے ہو تو راہ کھوٹی ہوتی ہے۔ایسے تم جانو۔پھر تو میں نے اس بات کے سنتے ہی نظر ربِ حقیقی کی طرف رکھ قدم تیز کئے اور شلیکیں بھرتا چلا۔پر ہر قدم پر دھیان اودھری تھا کہ سب کی منزلِ مقصود کا پہنچانے والا وہی ہے پھر ہمارا پہنچانا بھی اسے کچھ دور نہیں۔یہی خیال کرتا ہوا ایک دس بیس قدم آگے بڑھا تھا کہ پھر وہی دلِ ناصح ہمارا یوں بولا کہ کیوں بھائی یہ تو تم نے سنا ہوگا کہ مسافر جو آپس میں باتیں کرتے ہوئے جاتے ہیں تو راہ خوب کٹتی ہے پھر اس سے کیا بہتر ہے کہ کوئی قصہ حکایت کہانی بات ایسی کہتے چلو کہ جس سے راہ کٹے اور ماندگی مٹے تب اس سے میں نے یہ کہا کہ سنو بھائی جی بات کرنے میں بہت مشکل ہے اور مرتبہ سخن کا نہایت بلند ہے۔سخن گفتن وبکر جان سفتن است۔نہ ہر کس سزای سخن گفتن است اور مجھ بے چارے کی وہ حقیقت ہے کہ ملا کی دوڑ مسجد تک۔پھر جبکہ دو چار باتیں درست بولنی مشکل ہوں قصہ تو پھر قصہ ہے۔ہر چند تمہارا ارادہ میں خوب سمجھا کہ تمہیں فقط اختلاط ہی منظور ہے لیکن قباحت یہ آپڑی ہے کہ ہر طرح کی گفتگو کو ایک نہ ایک احوال ضرور ہے۔پھر اگر تمہاری خاطر سے کوئی بھولی بسری نقل کرنے لگوں اور اس میں کہیں تمہیں ہمیں غلطی معلوم ہو اور اس کی گرفت میں گلے کے ہار ہو پڑو تو اس کا علاج کیا۔تب ون نے مسکرا کر یہ کہا کہ خیر باشد اے بھائی تمہارا خیال کدھر گیا ہے۔جبکہ ہمیں احوال ہی سے کچھ کام نہ ہو پھر غلطی کس کا نام ہے کہ ہم اسے ڈھونڈھیں۔صرف لطفِ اختلاط اور حسنِ تقریر کے ہم تو بندے ہیں۔تب میں نے کہا کہ خیر اگر یوں ہے تو کیا مضائقہ مگر تھوڑی سی تمہید پہلے جب سن لوگے تب تمہارے خیال میں آوے گا کہ بنا اس کے کیوں کر ہوئے۔بعد اس کے اگر کوئی نقل بھی یاد آجاوے گی تو کہہ سناؤں گا۔اب لو سنو یہ تو تمہیں یقین ہے کہ اللہ تعالیٰ کی قدرتِ کاملہ ادراکِ بشری کے احاطہ سے باہر ہے اور سارے کارخانے دنیا کے تو بلاشبہ تاثیراتِ آسمانی ہی پر جاری ہیں اور تمام مخلوقات پر انسان کو اس لئے شرافت ہوئی کہ یہ جزو وکل کا ممیز و مدرک ٹھہرا اور اور سب کے سب اس دولت سے محروم رہے کیوں کہ ہر یکی را بہر کاری ساختند بے یعنی نہ ہو۔اب اس سے دھیان کیجیے کہ ہر دور ہر موسم ہر ستارے کا عمل واثر ثابت ہے کہ ساری باتیں اس کے مطابق پڑتی جاتی ہیں اب دیکھیے کہ اس عصر میں عجب طرح کا کامل اک شخص پیدا ہوا ہے کہ اگر اس کے کمالاتوں میں سے ایک شمہ بیان کروں تو طولِ کلام ہو جاوے۔چنانچہ ایک بات اس کی یہ

سننے میں نہ آئی ہوگی کہ ایک ہنر کوان نے علم بنا ڈالا۔ اب دیکھئے کہ دلی کی اردو کی زبان کوان نے صرف ونحو کے قاعدہ کے سانچے میں ڈھال کر علم بنا کر کھڑا کیا اور اس رتبہ پر پہنچایا کہ جسکی وہ زبان تھی ان کو جگی لگ گئی اور منہ دیکھ رہے سو اس کے قدر شناسی میں بھی ایسا شہرہ آفاق ہے کہ مدام اچھوں ہی کی تلاش میں رہتا ہے بلکہ دور دور سے ڈھونڈھ ڈھونڈھ کر اچھی اچھی قابل، لائق اشراف، نجیب لوگوں کو منگوا منگوا کر اپنا جلیس، ندیم، مصاحب، رفیق کیا اور انکا فراخور حال ہمیشہ تفقش خاطر ہے اور ایسا ہے کہ جیسا چاہئے اور سچ پوچھو تو اس کی فیض رسانی سے اب یہ علم کا دریا پڑا موج مارتا ہے اور ہے تو یوں کہ اس کی قدردانی کی ترغیب سے آج سب کو رغبت علم کی تحصیل کی ہے۔ اب تک اس سے غور فرمائیے کہ ایک تو اثر دور اور دوسرے اس کامل کی قدردانی کا افراط۔ ان دو باتوں کے جبر کے باعث سید ابوالقاسم سبزواری کو بھی اپنی زبان کے سنبھالنے کا اختیار نہ رہا پر نہ رہا اور کچھ نہ کچھ بولتے ہی بنا۔ پھر تو میں نے بھی لاچار ہو کر آنکھیں موند لیں اور منہ کھول دیا کہ اللہ کرے سو ہو۔ مگر اتنا غنیمت ہے کہ مجبور، خدائی کی گرفت سے دور و معذور رہے۔ والّا زمانے کے ہاتھ سے جی چھڑانا مشکل تھا۔ خیر اب لو۔ اگر کچھ سنا چاہتے ہو تو میرے سامنے ہو بیٹھو اور جو رطب و یابس جو کہ میں کہتا جاؤں وہی سنو اور چپکے ہو رہو۔ ہاں مگر اتنا دھیان چلا جاوے کہ اس گفت وگو میں وضع کتاب کی تو نہیں پائی جاتی اور وہ طرز اختلاط کا چھپا تا ہوا ہے یا نہیں کہ اس سارے بکھڑے سے مراد یہ ہے کہ سننے والوں کو لذت اختلاط کی اٹھے اور محظوظ ہوں اور جب یہ سنیں کہ اس کہانی کا نام حسنِ اختلاط ہے پھر قصد نام رکھے کا نہ کریں اور یہ وہ مسل (مثل) ہے کہ جو نام رکھتے ہیں وہ نام نہیں رکھتے بلکہ خذ ماصفا ودع ماکدر پر عمل کرتے ہیں اور اپنا تو وہ حال ہے کہ

بقدرِ حوصلہ ہر نیک و بد شناخت مرا	بدم بہ تہمتِ برباد کرد نیک بہ نیک

اب سنو بھائی جی۔ تمہید تو بہر صورت تمام ہوئی مگر دو چار شعر بھی سیدھے سیدھے گفت وگو کی وضع پر جو لکھنے میں آئے ہیں اس کا سن لینا بھی ضرور ہے۔ بعد اس کے اک کہانی بھی پرانی سی اب تو یاد آ گئی ہے۔ اسے بھی کہوں گا۔

سنو مجھ سے گر ہے تمہیں آرزو	کہ ہندی میں کرتے ہیں یوں گفتگو
کہانی مثل یا حکایات ہو	تکلف سے خالی نہ کوئی بات ہو

مزہ بات کا ہے گا یہ صاحبو	کہ دل جس کے سننے سے محظوظ ہو
پہ یہ بات چاہو کہ ہو ہر کہیں	نہیں ہے، نہیں ہے، نہیں ہے، نہیں
سمجھ شرط ہے گی ہر اک بات میں	جو سمجھو تو ہے بات ہر بات میں
خرد تو وہ شئے ہے کہ جس پاس ہو	کبھی پاس اس کا میاں پاس ہو
خرد ہے جسے وہ ہی انسان ہے	جسے یہ نہ ہووے وہ حیوان ہے
مقلد خرد مند ہووے جہاں	رہے کب کوئی بات اس سے نہاں
مگر یہ جو ہندی کی ہے بول چال	حصول اس کا تک غیر کو ہے محال
تعلم سے ہوں علم حاصل تو سب	مگر گفت وگو ہند کی ہے کو ڈھب
نہ ہو بولنے کی مہارت تمام	کسی طرح سیکھے رہے گا وہ خام
کرے غیر گر عمر کو صرف یاں	نہ ہووے وہ ہندی میں کامل زباں
نہ کڑوی ہے یہ طرز اس بات کی	نفی ہی سند ہے گی اس بات کی
یہ دیکھو عجائب زمانے کی چال	کہ یاں کچھ نہیں لڑتا اپنا خیال
مزے کی ہے یہ نقل سنیے ذرا	عجب طرح کا ہے گا یہ ماجرا
یہ شاید برس بیس کی بات ہے	پہ وہ سب مجھے یاد دن رات ہے
کہ اک دن میں تڑکے جو باہر گیا	سرِ راہ مجھ کو اک افسر ملا
کہ نام اس کا تھا گارڈن فوج میں	شب و روز رہتا تھا وہ موج میں
پہ تھی دوستی مجھ کو دن سے قدیم	کہ رہتا تھا اکثر جلیس و ندیم
پکڑ ہاتھ میرا بدستور خویش	کیا مہربانی کو از پیش بیش
غرض لے گیا اپنے گھر میں بلا	بٹھا کر کیا حاضری کی صلہ
تھے مسٹر کرسپ اور وہ میز یاں	نہ تھا تیسرا مجھ سوا کوئی واں
لگے حاضری کرنے ہم تینوں جب	کہ اک اور صاحب چلا آیا تب
لباسِ مغل میں وہ انگریز تھا	پر ایسا ہی وہ عقل میں تیز تھا
چمکتا تھا چہرہ تمام عقل سے	کہ نسبت نہیں اس کو کچھ نقل سے

نہوڑ کر کیا میں نے ان کو سلام ‏ ‏ کہ پوچھو تو پہلا یہی ہے کلام
نہ تھا مجھ کو تو بھی یہ ان سے گماں ‏ ‏ کہ وہ ہوں گے ہندی میں کامل زباں
پہ کہتا ہوں یارو اسے مانیو ‏ ‏ نہ جھوٹا مجھے تم یہاں جانیو
زباں کھولی ان نے جو ہندی میں آ ‏ ‏ پڑا دل یہ کہتا تھا اے مرحبا
فصاحت کا گر اس کی کیجیے بیاں ‏ ‏ تو ہووے قلم یاں قلم کی زباں
عجائب سنو اس کی اک اور بات ‏ ‏ کہ ہو عقل کی جیسے شطرنج مات
بھلا دیکھو صاحب یہ کیا کام ہے ‏ ‏ نہ آغاز جس کا نہ انجام ہے
کیا منکشف ان نے اس راز کو ‏ ‏ دیا ان نے انجام اس آغاز کو
کیا حرف و لفظوں کا وہ قا عد ہ ‏ ‏ کہ عالم کو جس سے ہوا فائدہ
غرض ہے گا وہ ایک صاحب کمال ‏ ‏ بجا ہے جو کہیے عدیم المثال
خدا ایسے کامل کو رکھے مدام ‏ ‏ نکلتا ہے جس سے ہزاروں کا کام
یہ ہے نام نامی کا اس سے سرشت ‏ ‏ لقب جان ہے نام ہے گلکرشت
کرو حق میں اس کی سبھی مل دعا ‏ ‏ کہ حق دیوے اس کا جو ہو مدعا
سلامت رکھے حق تعالیٰ اسے ‏ ‏ رکھے سب جگہ بول بالا اسے
چلا یارو اب یاں سے مطلب چلا ‏ ‏ کہ ہے رات تھوڑی و قصہ بڑا
کہانی کی لذت تو ہے رات کو ‏ ‏ سنو کان دھر کر مری بات کو
کہانی کہانی ہو مجھ سے اگر ‏ ‏ تو رکھیے ذرا کان اپنے ادھر
جب آپس میں (دو) شخص باتیں کریں ‏ ‏ تو لازم ہے آنکھیں برابر رہیں
یہ ہے عرض خدمت میں اے صاحباں ‏ ‏ ادھر دیکھیے میں نے کھولی زباں

ایھا الشائقین۔ اب سنو اس کہانی کو کہ اگلے زمانے کے لوگوں کی تحریر سے جو کچھ کہ احوال مملکتِ ہند کا جھوٹا سچا اپنے سننے میں آیا ہے اسے بحسنِ اختلاط سناتا ہوں کہ اگر کان دھر کر سنئے تو آگے کو کان ہوں اور یہ وہ مسل (مثل) ہے کہ نادان بات کہے اور دانا قیاس کرے۔ چنانچہ وجہ تسمیہ ہندوستان کا یہ ہے کہ یہ مملکت قدیم سے ہندوؤں کی تھی اور وہ اپنی اصطلاح میں صاحبِ تخت وتاج

کو راجہ کہتے تھے۔ اور دلی دار الخلافت بھی ون ہی (انہی) کی مقرر کی ہوئی ہے مگر وہ اپنی زبان دلی کو ہستنا نگر کہتے تھے۔ اور دار ومدار حاکم ومحکوم کا اس وقت اس وضع پر تھا کہ محکو حاکم کو اپنے اعتقاد درست سے واجب البرستش سمجھتے تھے بلکہ اس کی رضا مندی کو اپنی نیک بختی اور اطاعت، حسنِ اطاعت جانتےتھے اور حاکم بھی بدلِ رعایت وشفقت احسان، کرم ادنیٰ واعلیٰ کے حال پر فرزندانہ کئے جاتا تھا۔ پھر جب تک طرفین کا یہ عالم رہا کہ راجا راج اور پرجا سکھی یعنی وہ تو اپنے راج پر براجتے تھے اور خلقت آرام سے اپنے اوقات کاٹتی تھی چنانچہ راجہ بکر مادتیہ کے عمل تک ہند کی سلطنت کا اختیار انہی لوگوں کے ہاتھ میں بخوبی رہا اور بہت دنوں تک رہا پھر یہ تو کون وفساد ہے یہاں کون فساد سے بچا ہے اور بچے گا کہ وہ بچتے۔ پھر جب کہ ان کے اقبال کا آفتاب سوا نیزے پہ آپہونچا اور وے سرگرم تباہی کے ہوئے اور ایک کو دیکھ کر دوسرا جلنے لگا۔ رفتہ رفتہ پھر تو انہی کے بیچ میں سے ایسی اک آگ اٹھی کہ سب کے سب اکٹھے جل بجھے۔ اب سنئے یہ تحفہ ماجرا ہے کہ سک ادھت بکر مادھت کا ایک بھائی وحشی مزاج سا تھا کہ کچھ عرضہ نہ رکھتا تھا۔ ایک شب کیا جانئے کیا اس کے جی میں آگیا کہ اٹھا ہوا وہاں چلا جہاں بکر مادھت کا (کی) آرام گاہ تھا اور دیکھا کہ وہ پڑا سوتا ہے۔ غرض کسی حربے سے وہیں اسے سوتا ہی مار ڈالا۔ آپ راجہ ہو بیٹھا اور یہ بات جب ظاہر ہوئی تو سب کو ایک اچنبھا سا ہوگیا مگر سوائے اطاعت کے اور کچھ بن نہ آیا۔ پھر وہ جو قاعدہ جوان کے بیچ میں مقرر تھا اسی طرح پر سب کے سب اس کی فرماں برداری کرنے لگے۔ مگر اس کی حرکتِ نامعقول سے باطن میں ایک انحرف اور تنفر سب کو اس سے بہم پہونچا اور وہ ضوابط عدل وداد کے بھی جوان میں مدتوں سے جاری تھے اور وہی موجب سلطنت کے انتظام کا تھا وہ بھی سب ہل چل میں آگیا اور رونق حکومت کی مطلق نہ رہی بلکہ سارے اموروں میں بگاڑ پڑتا چلا۔ پھر تو بگڑتے بگڑتے یہاں تک نوبت پہونچی کہ تھوڑے دنوں میں سک ادھت کے ہاتھ سے سلطنت کا چراغ بجھ گیا اور ایسا بجھا کہ پھر روشن نہ ہوا اور وہ بنی بنائی سلطنت اور پکی پکائی ہانڈی اللہ تعالیٰ نے پٹھانوں کو دے دی۔ پھر جب کہ پٹھان مسلط ہوئے، ڈھانچہ سلطنت کا اپنے وضع پر درست کرنے لگے۔ آگے کے دستورات ہندوؤں کے وقت کے سب الٹ پلٹ کر ڈالے۔ راجاؤں کی جگہ بادشاہ ہو بیٹھے۔ دن بدن مقتدر ہوتے چلے۔ چھوٹے بڑے، ادنیٰ اعلیٰ کی تالیفِ قلوب پر کمر باندھ بیٹھے۔ عدل وانصاف رعایت اور سلوک کو

آگے سے بڑھایا اور ایسا بڑھایا کہ جلد نیک نام ہو گئے اور گرد و پیش کے سرکشوں کو بھی بتدبیر شائستہ زیرِ ضبط کر کے اپنی اطاعت کا کلمہ پڑھوا چھوڑا اور وے جماعت معزول کا کہ جن کا ملک ان کے ہاتھ آیا اور وے خلاف دین و مذہب کے باعث ان سے تنگ نفرت اور وحشت رکھتے تھے انہیں بھی دلاسہ، تسلی، محبت، دلجوئی سے اپنا کر ڈالا بلکہ عمدہ جہت ان کی جلد اسلوب پکڑنے کی یہی ہوئی کہ مدتوں تک ان کی حکومت کا طلسم نہ ٹوٹا اور روز بروز بڑھتی ہی گئی اور ایسا بڑھی کہ دور دور کے بڑے بڑے سلاطینوں کی آنکھوں میں کھٹکنے لگی۔ غرض جب تک ایام ان کی ترقی کے درست تھے، جو کرتے تھے وہ بن آتا تھا۔ تدبیریں بھی درست پڑتی جاتی تھیں۔ فوجیں بھی چیندہ تھیں، اہل مشورت بھی خوب تھے، خزانہ بھی وافر تھا۔ عزم و جراءت، دلاوری بھی جیسی چاہیے ویسی تھی۔ خلاصہ یہ کہ ان کی قسمت میں جب تک سلطنت تھی تب تک ان کے اقبال کا ستارہ چمک رہا تھا۔ اور وہ بھی سارے زمانے کی آنکھوں میں چمکے ہوئے تھے۔ مگر یہ چرخ بے قرار کب کسی کو قرار دیتا ہے۔ ہر کرا پنج روز نوبت اوست۔ اب اسے دیکھئے کہ جب پٹھانوں کا وقت تنزل کا آیا اور اقبال کا آفتاب غروب ہونے لگا تب ظاہراً اسی علت میں گرفتار ہوئے کہ جو ساری خرابیوں کی جڑ ہے۔ یعنی عجب و تکبر، عف و غرور اس مرتبہ پر ان کے مزاج میں آیا اور ان کی ذات میں سمایا کہ اعتدال سے گر گئے اور حفظ و مراتب عدل و انصاف کا بالکل ان کے بیچ میں نہ رہا۔ پھر تو باتیں بگڑتی چلیں۔ تدبیر الٹی پڑنے لگیں۔ ارکانِ دولت جتنے تھے ان میں نفاق بہم پہونچتا چلا۔ قومیں منحرف ہو گئیں۔ دفینوں کا نشان نہ رہا۔ سلطنت ضعیف ہو گئی۔ غرض دیکھتے دیکھتے یہ گھروندا بھی مٹ چلا اور جب تک یہ ہاتھ پاؤں سنبھالیں اور خبر دار ہوں، سلطنت کدھر اور حکومت کہاں۔ اور چرخ کو قرار سے کو تہہ۔ بلکہ اس کا یہ عالم ہے اور یہی کام ہے کہ ہزاروں کو مثلِ خاک زمیں سے اٹھا کر بگولے کی طرح چرخ دیتا ہوا آسمان تک لے جاتا ہے پھر جہاں حد کو پہونچا اور اس کی ہوا جاتی رہی اور گرا۔ پھر وہ حقیقت ہے کہ چڑھتے کو سب نے دیکھا اور گرتے کو کسی نے نہ دیکھا کہ پامال ہو گیا۔ چنانچہ ادھر تو تورانی مسلط ہو گئے اور ادھر بھاگا بھاگ پڑ گئی بلکہ جان بچانی مشکل ہو گئی۔ اللہ کی قدرت کا تماشہ یہ دیکھیے کہ ان پٹھانوں کے سرداروں میں سے جو دعوٰی رستمی و بہادری کا رکھتے تھے، بات جب بگڑ گئی پھر تو راہ بھاگنے کی انہیں نہ ملتی تھی اور پانی سے پتلے ہو چوہوں کے بلوں میں سر چھپاتے پھرتے تھے کہ دیکھنے

والے یہ کہتے تھے کہ فاعتبروا یا اولی الابصار۔ یعنی عبرت پکڑو اے دیکھنے والو۔ غرض اللہ برا وقت کسی کو نہ دکھلاوے کہ بگڑی پر تو بھی بھلی ہے ایھا السامعین۔ اب سنو تورانیوں کا احوال کہ یہ اس سے بھی لطیف تر ہے۔ پھر جب کہ ہندوستان کی مملکت میں اہل توران کا تسلط واقع ہوا اور انہوں نے توجہ اموراتِ سلطنت پر کی۔ اول یہ تھا کہ سابق کے نقش مٹا کر اپنے نقش بٹھانے لگے اور سبھی باتوں کو الٹ پلٹ کر اپنے دستورات پر ترتیب دینے لگے اور یہ وہ بات ہے کہ ہر کہ آمد عمارتِ نو ساخت۔ رفت و منزل بدیگری پرداخت۔ پھر تو رفتہ رفتہ جو اقبال مندوں کے آثار ہیں وہ سب ان سے ظہور میں آنے لگے۔ تامل و آہستگی سے اموراتِ مالی و ملکی کو بخوبی استحکام دیا اور مضبوط کیا۔ معتمد لوگوں کو اپنا راز دار کیا، فوجوں کو آراستہ کر جہاں جہاں مناسب و ضرور جانا، وہاں متعین کیا۔ جب سب طرح کی رخنہ بندیاں عمل میں آ چکیں اور اس سے خوب فراغت حاصل ہوئی تب خلق اللہ کی رفاہیت پر مصروف ہوئے۔ عدل و انصاف کرنے لگے۔ غربا کے ساتھ رعایت و سلوک نجابت اخلاق و مدارات جو کچھ کہ مناسب جانا وہ کیا۔ غرض رات و دن ہوشیاری و خبرداری سلطنت و جہانداری کرنے لگے۔ چنانچہ دیکھتے دیکھتے ان کا جاہ و جلال اور اقتدار ایسا بڑھا اور کمال کو پہونچا کہ سارا زمانہ ان سے دبنے لگا اور دور دور تک نوبت باج و خراج کی پہونچ گئی۔ بلکہ وہ جو اپنی بزرگی کے سامنے کسی کو خاطر میں نہ لاتے تھے اور ہم چشم نہ جانتے تھے، انہوں نے بھی کان کھڑے کئے اور نہایت چوکنے ہوئے بلکہ فکر یہ پڑی کہ کسی طرح بنا آشتی کی ڈالا چاہیے اور ہر ایک نے جس طرح پر راہ پائی ایک دار و مدار کیا ہی کیا۔ اور واقعہ تو یوں ہے کہ بمرورِ ایام ان تورانیوں نے بھی بہت سی صفتیں اچھی پیدا کیں چنانچہ جود و کرم تو ایسا تھا، جسے ایک نظرِ الطاف سے دیکھا پھر معاذ و عفت ہزاری ہزاری تو ہو گیا۔ بلکہ آخر آخر اسی بات کی افراط سے سلطنت ضعیف ہو گئی۔ اور ضبط نہ رہا۔ مگر ایک چند روز تو علو اقتدار ایسا رہا کہ سلطنت تو کیا چیز ہے باللہ کہ زمین پر خدائی کرتے تھے۔ چنانچہ عدل و داد بھی اس درجہ پر تھا کہ چھوٹے بڑے، ادنیٰ اعلیٰ، امیر فقیر، مسافر مقیم محتاج، غنی، سب کے سب ان کا دوام و قیام چاہا کئے۔ بلکہ یہ خیال غلط کرتے تھے کہ شاید تا قیامت یہی رہیں گے۔ پھر یہ تو کب کسی کے واسطے ہوا ہے کہ ان کے واسطے ہوتا۔ غرض کہ جب ان کے اقبال کے ایام حد کو پہنچے اور آثار و ادبار نکبت کے نمودار ہوئے، تدبیروں میں کچلک پڑنے لگے۔ غرور کے پردوں سے آنکھیں

ڈھپ گئیں۔ دور بینیاں اور مآل اندیشیاں سب جاتی رہیں۔ انتظامِ سلطنت سے غافل ہو عیش کی طرف مصروف ہوئے اور ارکانِ دولت چار و ناچار طبیعت کرنے لگے۔ غفلت نے دلوں میں راہ پائی۔ مگر یہ کہ کوئی حریفِ زبردست مقابل نہ تھا چندروز یوں بھی کٹ گئے اور اگر پوچھئے تو اورنگ زیب بادشاہ کے وقت سے خرابی شروع ہوئی۔ چنانچہ اس کے آگے ہندوستان کے بادشاہوں میں سے کسی نے یہ سلوک اپنے باپ سے نہ کیا تھا جیسا کہ اس بزرگ نے کیا۔ اور بعد عالمگیر کے تو بھی پھر آپس میں ایسی دھما چوکڑی مچی کہ جن نے جسے جہاں قابو میں پایا وہیں مار ڈالا۔ غرض تا اواخر فرخ سیر بلکہ اوائلِ محمد شاہ تک خوب ہی کشاکش چلی آئی اور ایک چندروز تک شاہزادوں کے سر یوں کٹے کہ گویا بیل بکرے تھے۔ پھر جب تک محمد شاہ نے قرار واقعی تسلط پکڑا، تھوڑے دنوں توفی الجملہ ایک امن سا رہا۔ پھر بادشاہ کا مزاج جب عیش پر آیا اور وسعتِ ملک، افراطِ خزائن، کثرتِ فوج پر خیال کیا۔ پھر تو بے پروا ہو گئے اور دن بدن غفلت زیادہ ہوتی گئی۔ بے خبری ہاتھ باندھ کر روبرو آکھڑی ہوئی۔ پھر سلطنت کدھر اور انتظام کہاں۔ غرض جبکہ ارکانِ دولت یہ سمجھے کہ بادشاہ بے خبر ہے ہر یک خودسر ہو بیٹھا اور سیاہ و سفید چاہا سو کرنے لگے اور وے لوگ کہ جنہیں عالم عیش کی مصاحبتِ حضور میں بہم پہونچی ان کو تو اس گھمنڈ نے لیا کہ جو ہیں سو ہم ہیں اور اپنے حد سے بڑھ کر قدم رکھنے لگے اور یہی بات موجب نفاق ان کے بیچ میں ہوئی مگر جب تک پردے میں تھی کچھ اروحریز چلی گئی۔ رفتہ رفتہ جب علانیہ ہوئی تب آپس میں نزاع بہم پہونچی۔ ایک دوسرے کا حریف ہو گیا اور آپس کی عداوتوں سے سلطنت کی خرابی کی فکر میں ہو گئے اور اس کی تدبیریں کرنے لگے۔ اب یہاں تک غور فرمایئے تو اقبال و ادبار کا معمہ صاف نظر میں آجاتا ہے۔ چنانچہ یہ وہی لوگ ہیں کہ جاں فشانیاں و خیر خواہیاں و پاسِ نمکِ خداوند بہ دل و جاں کرتے چلے آئے اور آپس میں بھی ایک دوسرے کی حرمت و پاس داری پر مصروف تھے۔ پھر جب بات بگڑ گئی تب سارے فساد بھی انہیں لوگوں سے برپا ہوئے۔ پھر اسے تاسیراتِ اقبال و ادبار نہ کہیے تو کیا کہیے۔ قطع نظر اس سے، سنئے کہ آخر آخر ان لوگوں کے نفاق نے کیا کیا یعنی بہ ترغیب ایران سے نادر شاہ کو بلا، ملک لٹوا، غربا پسوا، سلطنت کو ڈبایا اور یہ تو کل کی بات ہے۔ اس کی تفصیل ضرور نہیں۔ مگر اس خرابی کے بعد بھی وہ بغض و حسد آپس کا نہ گیا پر نہ گیا۔ اور اسی جہت سے رہی سہی سلطنت بھی سست ہوتی چلی گئی اور یہاں تک نوبت پہونچی

کہ زیرِ قنات بادشاہ کی آپس میں خانہ جنگیاں کرنے لگے۔ پھر کوئی دن ایسا نہ تھا کہ دو چار مارے نہ جاتے اور یہ بات بڑھتے بڑھتے ایسی بڑھی کہ ضبطِ بادشاہی سے باہر ہو گئی۔ اور جن نے فکر اس کے دفع کی کی کچھ فائدہ نہ ہوا بلکہ زیادہ ہی ہوتی گئی اور رفتہ رفتہ نوبت یہاں تک آئی کہ دن دوپہر دو چار مسلح اکٹھے ہو جس مالدار یا مہاجن کے گھر میں چاہا کود پڑیا گر یہ سامنے ہوا تو یہ پانچ چار، وہ ایک۔ کیا ہو سکتا ہے۔ سو رما چنا بھاڑ نہیں پھوڑ سکتا۔ غرض اسے مار، گھر بار لوٹ، بفراغت نکلے چلے گئے اور کسے نے نہ پوچھا کہ کون تھے اور کیا کیا اور کدھر گئے۔ پھر جب یہ عالم دار السلطنت کا ہوا کہ اردو میں ڈاکہ پڑنے لگے، پھر وہ شہر کب آباد رہ سکتا ہے۔ چنانچہ عدل سے انتظام ہے و انتظام سے آبادی ہے۔ پھر جب عدل ہی جاتا رہا تو کہیے کہ کیا رہا۔ غرض کہ ساری باتیں بگڑتی ہی چلیں۔ تب وہ عالم ہو گیا کہ ہر لری و ہر بازاری پھر تو جتنے اہلِ عصمت و عزت لوگ تھے ان کو اس شہر کا رہنا دو بھر ہو گیا۔ اور سخت گھبرائے کہ کیا کیا چاہیے اور اس کی تدبیر میں تامل کر یہ سمجھے کہ حب الوطنی سے ہاتھ اٹھا کر جلا وطنی کو قبول کیا ہی چاہیے۔ اور ایک جم غفیر وہاں نکلا اور جدھر کو ان کا خیال بندھا ادھر ہی کو منہ اٹھایا اور چلے گئے۔ مگر اس میں تھوڑے سے لوگ جو بنگالے کی طرف امنیت کا خیال کر جا ٹھہرے ان کا یہ مذکور ہے چنانچہ وہ وقت نواب جعفر خاں کا تھا۔ اور نفیر و تظمیر، رطن و فتق، ضبط و ربط، چال ڈھال طرح ترکیب، بندوبست ملک کا بہت اچھا تھا۔ اور ہنرمند و اہلِ کمال معزز تھے۔ پھر یہ واردین جو وہاں جا کر جمع ہوئے تھے ہر یک کو موافق اس کی رسائی کے روزگار بہم پہونچا مگر حاجی احمد اور مرزا بندے دو بھائی، اہل شاہ جہاں آباد جو اس جماعت کے شامل وارد تھے، ان کی تلاش اور ہی وضع پر تھی اور وہ دونوں بھائی نہایت فہمیدہ و سنجیدہ، زمانے کے سرد گرم چشیدہ تھے، چندروز ہوائے کار کو دیکھتے رہے۔ جب نواب سرفراز خاں پر صوبہ داری نے بنگالے کی قرار پکڑا۔ اس قوت انھوں نے بھی تلاشِ روزگار شروع کیا اور دیکھتے دیکھتے نواب کے دخیلِ صحبت، خلا ملا ہو گئے اور ایک چندروز میں موردِ عنایات و خدمات ہو مرزا بندے الا وردیخاں ہوئے اور صوبہ عظیم آباد کے مختار ہو مہابت جنگ کا خطاب پایا اور مقتدر ہوتے چلا اور فوجوں کو آراستہ کرنے لگا اور اچھے لوگوں کو اپنا رفیق کیا اور ان سے عہد و پیماں بہ قسم و اقسام مضبوط کیا اور اسباب جیسا چاہتا تھا ویسا اکٹھا کیا۔ پھر سب طرف سے جب خاطر جمع ہوئی تب بنگالے کی تسخیر کا ارادہ کر بیٹھا اور اس کی تدبیر کرنے لگا اور حاجی احمد تو وہاں نواب

کی صحبت میں نہایت ہی رچا ہوا اور انیس وجلیس تھا۔ اور وہاں کی خبریں مدام بھائی کو لکھتا رہتا
تھا بلکہ ساری تدبیریں اس کی صلاح پر منحصر تھیں۔ پھر جب آپ نے وقت مناسب اور اپنی خواہش
کے موافق دیکھا۔ وونہیں مہابت جنگ کو لکھا کہ چلے آؤ اور مہابت جنگ نے اپنے بھائی کے
اشارے بموجب عظیم آباد سے جب حرکت کی اور چلا اور ایسے تحمل سے چلا کہ سرفراز خان کی فوجوں
کا یہ مقدور نہ تھا کہ اس کے سدِ راہ ہوں اور سامنا کریں۔ مگر جب یہ خبر مرشد آباد میں پہونچی اور
منتشر ہوئی کہ مہابت جنگ عظیم آباد سے بہ اراد و فاسد عازم بنگالے کا ہوا اور آتا ہے تب وے جو
دولت خواہ سرفراز خاں کے تھے وونہوں (انھوں) نے حضور میں عرض کی کہ مہابت جنگ بڑی تیاری
سے مستعد جنگ اس طرف آتا ہے اگر حکم ہو تو یہاں بھی تیاری کر آگے بڑھ اسے روکیں۔ اس بات
کو سن نواب نے حاجی احمد کو حضور میں بلا بھیجا اور پوچھا کہ یہ کیا ماجرا ہے۔ اور بدون اذن کہ
میرے مہابت جنگ نے قصد ادھر آنے کا کیوں کیا۔ حاجی نے عرض کی مدتوں سے اس غلام نے
قدم نہیں دیکھے ہیں اور مکرر عرضیاں بھی جوگئیں اس کے جواب میں بھی ماذون نہ ہوا تب لاچار ہو کر
ادھر کا قاصد ہوا ہے۔ مگر یہ لوگ جو اس نمک پروردہ کو بدنام کرتے ہیں اور گمان فساد کا رکھتے ہیں
۔ یہ محض بخل وحسد ہے اور کچھ نہیں۔ اس کو تو مدام دعویٰ غلامی و بندگی ہی کا ہے۔ چنانچہ اس کے یہ
خطوط جو غلام کو لکھے ہیں حاضر ہیں۔ ملاحظہ ہوں تو سب کیفیت معلوم ہو جاتی ہے۔ چنانچہ ان خطوط
کے ملاحظہ سے صداقت حاجی احمد کی متحقق ہوئی اور وے (وہ) مخبر سب کے سب معاتب ہوئے۔
غرض یہ کہ نواب سرفراز خاں کا عالم صاحب زادگی کا تھا۔ دوست دشمن کی پہچان کا ہے کو تھی۔ اوقات
عیش میں کٹتے تھے۔ سختی وسستی سے آشنا نہ تھا۔ زمانے کی اونچ نیچ پر کبھی بھول سے نگاہیں نہیں پڑیں۔
اچھے خاصے صاحب زادے اس ملک کے جیسے ہوتے ہیں ویسے تھے۔ پھر وے خیر اندیش اس کے
خجالت کھینچ کر چپکے ہو رہے کہ اتنے میں یہ خبر پہونچی کہ مہابت جنگ مع فوج سکری کے ادھر آیا۔ پھر
تو لوگ نواب کو سمجھا بجھا کر لے ہی نکلے اور شہر سے ایک دو منزل باہر پڑاؤ کیا اور فی الجملہ فوجوں کو
درست کر جا بجا متعین کیا اور خبرداریاں کرنے لگے کہ اس میں حاجی احمد کو اس فکر نے لیا کہ کسی طرح
نکل جایا چاہیے۔ چنانچہ حضور میں نواب کے جا کر یہ عرض کی کہ خداوند نعمت کی پرورش جو ہم غلاموں
کے حق میں ہوئی ہے اور ہوتی ہے یہی موجب سب کے رشک کا ہوا ہے کہ ہم خانہ زادوں کو یہ نمک

حرامی متہم کرتی ہیں۔ اگر حکم ہو تو غلام جا کر اس کے ہاتھ رومال سے باندھ کر اکیلا حضور میں لے
آوے۔ پھر یہ بات تو حاجی کی ان کو بہت پسند آئی اور فرمایا کہ بہت بہتر تو جا اور اسے لے آ۔ اور وہ
جب یہاں آوے گا تو میں ان لوگوں سے خوب سمجھوں گا کہ جنھوں نے اسے بدنام کیا ہے۔ ہر چند
لوگ منع کرتے رہے کہ حاجی کو نہ جانے دیجیے۔ نہ مانا پر نہ مانا اور رخصت کیا ہی کیا۔ غرض حاجی نے
آداب بجا اور رخصت ہو مسل (مثل) برق پلک مارتے میں اپنے بھائی کی فوج میں آملا اور مہابت
جنگ کو بھی فی الحقیقت انتظار بھائی کے آنے کا تھا۔ اس خبر کے سنتے ہی نہایت خوش و بشاش ہوا اور
بھائی کے آملنے کو اپنے مرکوزِ باطنی کی فالِ نیک سمجھا اور اپنا عروج اقبال ویسے جانا اور مصلحت بھائی
سے کر وہ جو مخصوص لوگ بچے ہوئے تھے وونہیں (انہیں) مع چار پانچ ضرب توپ اچھی ساتھ لے
بخوبی تمام دریا کے پار اترا، شباشب سرفراز خاں کی پشت پر آرہا اور ایک توپ کو تیار کر نواب کے
خیمے کے مقابل رکھ تمام شب ہاتھی پر چڑھا ہوا اسی توپ کے پاس باشغال اوراد کھڑا رہا اور تماشہ یہ
ہے کہ اودھر (ادھر) والوں کو مطلق معلوم نہ ہوا کہ اتنے میں پو پھٹنے لگی اور مرغا بولا ہے کہ فجر ہوئی اور
گجر بجنے لگے کہ اتنے میں اس مدبر نے توپچی کی طرف اشارہ کیا اور اسے سمجھ توپچی نے دوڑ کر پلیتے
سے ہاتھ ملائے اور پلیتے نے منہ لال کر کچھ ایسا اس توپ کے کان میں پھونکا کہ وہ سنتے ہی آگ ہو
گئی اور ایسی کڑکی کہ منہ کا نوالا چھوٹ گیا اور سب ہول کھانے لگے اور مارا مار نے ایسا زہر اگلا کہ
حریف کی فوج کو چھٹی کا دودھ یاد آنے لگا۔ پھر ایسید یکھیے کہ یہ مستعد وے غافل۔ اب فرمائیے کیا
ہو سکتا ہے۔ یہ وہ نقل ہے کہ سر منڈاتے ہی اولے پڑنے لگے۔ غرض بے سروپائی سے نواب سرفراز
خاں کو ہاتھی پر چڑھا کر ایک دس بیس ہی قدم آگے بڑھے تھے کہ خدا جانے ایک گولی قضا کی کدھر
سے آئی اور لگ گئی اور مطلع صاف ہو گیا۔ پھر تو دھینگ دھینگ بلوں کا راج تھا۔ نواب کی لاش تو
ہاتھی پر ڈال کر شہر کو لے گئے اور یہاں لشکر لوٹنے لگا۔ بعضے سردار جو نشہ مردی کا رکھتے تھے وہ بھی لڑ
موئے اور کچھ زخمی ہوئے، کچھ دستگیر ہوئے۔ مہابت جنگ کی طرف شادیانے بجنے لگے۔ نوبت
صوبہ داری کی پہونچ گئی۔ کاجتے ماجتے شہر میں داخل ہو قلعہ میں بیٹھ نذریں لینے لگا اور قرار واقعی
تسلط جیسا چاہیے معاویسا ہو گیا۔ پھر جو رسم و آئین صوبہ داری کے استحکام کی تھی تھوڑے ہی دنوں
میں بعنوان شائستہ و بائستہ انھوں نے درست کیے اور ایسے درست کیے کہ دن بدن اقتدار بڑھتا ہی

گیااور ایسی فوجیں آراستہ کیں کہ تامدت العمر اپنے پایۂ استقلال میں کہیں لغزش نہ پائی۔ چونکہ مہابت جنگ بوڑھا، کہن سال، ظریف وخوش گو تھا یہ ایک چھوٹی سی نقل اس کی زبانی ہے۔ کہنے لگا کہ بعد فتح جب میں شہر میں داخل ہونے لگا تو گھوڑے پر سوار ہولیا کہ سب دیکھیں اور مضبوط وقوی جانیں۔ چنانچہ جب عین بازار میں پہونچا تو دیکھتا ہوں کہ پانچ چار رنڈیاں اکٹھے کھڑی ہیں۔ ان میں سے ایک نے مجھے دیکھ کر یہ کہا کہ بنگالے نے برتو پایا پر بوڑھا پایا۔ میں نے اس کی بات سن کر گھوڑے کی باگ لی اور کدانے لگا تب ان نے یہ کہا کہ بوڑھا تو تھا پر مسخرا بھی ہے۔ غرض بڑا ہی مدبر، کز چہ دار ینہ تھا اور پست وبلند زمانے کا بہت سا دیکھا تھا۔ جب تک جیتا رہا۔ اپنے پرائے کسی کا ہاتھ اس پر نہ پڑ سکا اور کسی لڑائی میں ان نے شکست بھی نہیں کھائی۔ اور اس بوڑھے کا اقبال تا زیست جوان ہی رہا۔

مگر دو بیٹیوں کے سوائے خود اولاد نہ رکھتا تھا۔ اس سبب ہیبت جنگ کے بیٹے کو نہایت دوست رکھتا تھا اور وہ مہابت جنگ کی بیٹی کا بیٹا کہ جسے نواسا کہتے ہیں اور ہیبت جنگ کا بیٹا کہ مہابت جنگ کے بھائی کی بیٹی کا بیٹا پوتا تھا و نام اس کا محمدی خطاب سراج الدولہ کہ اس کو اپنے حین حیات میں ولی عہد کیا۔ چنانچہ بعد فوت مہابت جنگ کے وہی صوبہ دار ہوا۔ پھر اس کی بے فیضی تو مشہور ہے کہ بے عقل، سفیہہ، مغرور، نا تجربہ کار، بے خبر، عیاش، برخود غلط، خدا ناترس، آدم کش، ارذل دوست، ناخن شنو، پھر جس میں کہ یہ صفات جمع ہوں اس کے ہاتھ میں ملک کب رہ سکتا ہے۔ غرض ایک برس بھی گذرنے نہ پایا کہ جتنے وضع وشریف تھے اس کے افعال زشت سے سب کا دم ناک پر آ گیا اور جتنے اہل توقیر وعزت تھے جنکی پاس داریاں خود مہابت جنگ کرتا تھا، وے تو سب بیدل ہو کر کنارہ پکڑ بیٹھے اور ان کی جگہ میں اجلاف داخلِ صحبت، انیس وجلیس، مصاحب، ندیم، پیش دست وصلاح کار ہوگئے۔ یہ تو مشہور ہے کہ :

کسے را کہ شیطاں بود یار غار   ہم آں کند کس نباید بکار

اب پہلی بسم اللہ غلط دیکھیے کہ ان مصاحبوں نے اپنے صاحب کو پورنیہ کی تسخیر پر کمر بندھوائی اور لے نکلے کہ ان نے اپنے بھائی بے چارے شوکت جنگ کو مار کے اپنے ہاتھ سے اپنا بازو توڑا اور بعد اس فتح کے نہایت اپنی بہادری کا گھمنڈ ہوا اور وے صلاح کار نابکاروں نے آگے سے زیادہ

اعتبار بہم پہونچایا۔ موردِ عنایات ہوئے اور ان کا وہ عالم ہوا کہ صلاح ما ہمہ آنست کان تراست صلاح۔ پھر تو دور دوران کا تھا اور وہ جو کہتے تھے وہ ہوتا تھا۔ پھر تھوڑے دنوں بعد ان صلاح کاروں نے یہ صلاح دی کہ اب کلکتے کو لے لیا چاہئے۔ اور ان کی بات تو ٹلنے والی نہ تھی۔ سراج الدولہ کے مزاج کو پھیرا ہی پھیرا۔ اور لائے اس طرف اور تیاری کرتے ہی نکلے مگر جب یہ بات شائع ہوئی اور کھل گئی تب تو وے پختہ کار اس کے نانا کے وقت کے خانہ نشیں باہم ہو کر سراج الدولہ کے پاس گئے اور عرض یہ کی کہ دیکھو تمہارا نانا ایسا دانا، مدبر، عاقل، اور اتنی مدت صوبہ داری کی مگر یہ ارادہ بھی نہ کیا بلکہ بعض لوگوں نے جو اس محل میں عرض بھی کی تھی ان سے بہ عتاب وخطاب پیش آیا اور اس بات کو کبھی خاطر میں نہ لایا۔ پھر تم بھی اس کے ولی عہد ہو۔ چاہئے یوں کہ اس کے قدم پر قدم رکھو اور ہرگز یہ قصد نہ کرو۔ ہر چند وے سب کے سب سر پٹکتے رہے پر وہ کوئی مانتا تھا۔ غرض وہ جو ارادہ کیا تھا اس سے نہ پھرا اور چلا ہی آیا۔ اور بہت سے بندۂ خدا بے گناہوں کو بے حق بے موجب تہ تیغ کیا۔ پھر یہ تو ظاہر ہے کہ جن نے ببول بوئے ہوں وہ آم کہاں سے کھائے گا۔ پھر تو وہ کچھ دیکھا کہ جو دیکھنا تھا اور جن لوگوں پر نہایت اپنی خیر خواہی کا بھروسہ رکھتا تھا جو کچھ کہ ہوا انہیں کے ہاتھوں سے ہوا۔ اور وہ ہوا کہ جس کا گمان نہ تھا۔ اب اسے غور فرمایئے کہ جس کے ہاتھ سے ایک عالم خدا کا ناحق پامال ہو گیا ہو پھر وہ کیوں کر بچے گا۔ چنانچہ اس محل میں اہل تجربہ یوں کہہ گئے ہیں اور یہ بھی اس کے ساتھ ہے کہ :

باں نہبد جہاں داری دریں کاخ   کہ با موری کند یاری دریں کاخ

پھر جب کہ اس عادلِ حقیقی کا عدل مجسم ہو کھڑا ہوا اور وہ ظلم وستم اور خونِ ناحق کی مکافات کی آگ دہکی اور شعلہ اس کا بلند ہوا اور لگے سراج الدولہ کے ہمائے اقبال کے پر جلنے اور بات بگڑ گئی۔ اور ایسی بگڑ گئی کہ تنکے کا آسرا ڈھونڈتے تھے اور نہ ملتا تھا۔ تب انہیں یہ شعر یاد آیا کہ :

نیم شبی آہ زند پیر زال   دولت صد سال کند پائمال

پھر تو جوان پر بیتی وہ کل کی بات ہے اور سب جانتے ہیں۔ غرض بعد اس انقلاب کے اللہ تعالی نے اس ملک کا زمام اختیار اپنے ان بندوں کے ہاتھ میں دے دیا جو کہ عدل وانصاف سے بھرے ہوئے تھے اور جب ان کا تسلط واقعی ہوا دفعتہً ایسا امن وامان ہو گیا کہ باگ اور بکری اکٹھے

پانی پینے لگے اور ایک چین سا ہو گیا۔ اور روز بروز عدل کی ترقی ہونے لگی اور جتنی باتیں نا منتظم تھیں سب انتظام پکڑتی چلیں۔ بڑے چھوٹے جتنے تھے سب کے موافق سلوک کرنے لگے اور جہاں تک امورات صوبہ داری کی پست و بلند ہو گئی تھی سب کو ایسا ہموار کیا کہ دن بدن رونق زیادہ ہوتی چلی اور عدل و انصاف بڑھتا ہی چلا گیا۔ پھر تو یہ طبقہ داناؤں کا ایسا ہے کہ سارے سلف والے اپنی کتابوں میں انہیں دانا اور عاقل لکھتے چلے گئے ہیں اور فی الواقع کہ ایسے ہی ہیں۔ چنانچہ یہ ایک بات دیکھیے کہ اب سے ان کی ہے کہ ہزار بات کے برابر کہئے۔ یعنی جس کام کو کیا چاہتی ہیں بہ تامل تمام پانچ چار عاقل ایک جگہ بیٹھ کر تجویز کرتے ہیں اور جب سب کی رائے کا اتفاق ہوتا ہے تب اس میں ہاتھ ڈالتے ہیں۔ اس سبب ان کی کسی بات میں لغزش نہیں ہوتی۔ غرض جب لگے ملک کا بند و بست کرنے اور پیش دست درکار ہوئی تب وے لوگ اہلِ رشد نام و نشاں والے مغل ہندوستانی کارکردہ مالی و ملکی معاملہ سے واقف و آگاہ جو تھے، انہی کو سرفراز کیا اور کام لینے لگے اور چند مدت یہ بات یوں ہی چلی گئی مگر یہاں کے لوگ تو اپنے طالع کی نارسائی و بدبختی کے باعث اپنے بھائی کے اصول و فروغ کو بھول بیٹھے تھے اور تو معلوم اور فضولی کے تو بادشاہ ہیں بلکہ اسے اپنی بڑائی اور بزرگی و فخر جانتے تھے اور عجب و تکبر و غرور کو جاہ و جلال سمجھے ہوئے تھے اس سبب زمانے کے پست و بلند کو بھی ایک کھیل سا جانتے تھے، چنانچہ ان سرداروں نے جنھیں خاک سے اٹھا کر آسمان پر پہنچا دیا تھا پھر انہیں لوگوں سے ایسی ایسی حرکاتِ ناشائستہ عمل میں آئیں کہ موجب خرابی کا ان کے ہو گیا بلکہ ان کے ساتھ لاکھوں خراب ہو گئے۔

بے ادب تنہا نہ خود را داشت بد   بلکہ آتش در ہمہ آفاق زد

اور سب کا اعتبار جاتا رہا بلکہ دن بدن گرفتارِ ادبار ہی ہوتے چلے گئے۔ یہاں تک کہ دل سے اتر گئے اور نظروں سے گر گئے اور ایسے گرے کہ جرگے کے جرگے سے عدم اطمینان ہو گیا اور فرقہ ثانیہ عرصے میں آنے لگے اور عرضہ پکڑتے چلے۔ رفتہ رفتہ ساری امورات میں دخیل ہو گئے اور کام خاطر خواہ سرداروں کے لگے کرنے اور تربیت پاتے پاتے یک چیز ہو گئے۔ اور تربیت کو تو وہ اثر ہے کہ حیوان آدمی ہو جاتا ہے۔ غرض اپنی قدیم وضع اوضاع باپ دادے کی بدل راکسس گندھ اتارو مانس گندھ چڑھا متشخص ہوتے چلے اور لگے فرقہ اولیٰ پر طعن و تشنیع کرنے اور اپنی کارگذاری پر

نازاں ہو کر یہ ضرب المثل پڑھا کرتے تھے کہ :

پسر نوح با بداں بہ نشست   خاندانِ نبوتش گم شد

سگِ اصحاف کہف روز چند   ز پیکاں گرفت مردم شد

اگر (چہ) اس میں ان کا کچھ قصور نہیں۔ جب کہ اصالت حیواں میں چاہتے ہو پھر انسانوں میں تو بطریق اولیٰ ضرور ہے۔ پھر یہ تو مشہور ہے کہ منہ لگائی ڈومنی گاوے تال بیتال۔ پھر اس وقت میں سرداروں کو تو اپنا کام منظور تھا اور ان باتوں کی طرف اصلا متوجہ نہ تھے مگر بمرور ایام جب تک یہ معمہ کھلے ہی کھلے تب تک وہ مالا مال ہو گئے اور ان کی جڑیں پتال (پاتال) کو لگ گئیں۔ پھر اہلِ زر تو سب جگہ بظاہر عزیز و موقر ہیں اور ان کے حال پر یہ شعر دال ہے کہ :

بمنت ہر کہ نقدِ سیم باشد   سگِ او واجب التعظیم باشد

مگر اہلِ ہندوستان کہ بدون نجابت فقط مالداری سے کبھی عزت نہ پکڑیں کہ اگر گنجِ قارون رکھتا ہو۔ پھر یہ تو عاقل و دانا ہیں۔ ان کے سامنے کب کوئی بات پردے میں رہ سکتی ہے۔ آخر یہ بات بھی کھل گئی و بخوبی معلوم ہو گئی مگر سابق والوں کی نابکاریاں اور ان کی کارگذاریوں کا خیال کر کے یہ تصور کیا کہ مسکین خر اگرچہ بے تمیز است۔ چوں بار برد ہمی عزیز است۔ اور رہنے دیا کہ رہ گئے۔ اور فرقہ اولیٰ کی اقوام تو اپنی بدبختی و نکبت و نحوست میں ایسی الجھی تھی کہ کسی طرح نہ سلجھی بلکہ ٹکڑوں کو عاجز ہو کر لاکھوں خاک میں مل گئی اور جو رہی سو گردابِ تباہی میں پڑی۔ اوقات کاٹا کی اور دن بھرتی رہی مگر وہ رزاقِ حقیقی برے بھلے بندوں کا پالنے والا اور دانا و نادان کا روزی دینے والا بلکہ :

بہ ناداں انچناں روزی رساند   کہ دانا اندر آں حیراں بماند

تھوڑے بہت سے سب کی پرورش کرتا ہے۔ چنانچہ بعصیاں در رزق ہر کس نہ بست۔ اب دیکھیے کہ خالقِ ارض و سمانے بعض صفتیں اپنے اپنے بندوں کو بھی دی ہیں خصوصاً سلاطین و حکام کی ذات میں واجب و لازم جان کر عنایت کیں کہ رفاہِ خلائق اس سے وابستہ ہے یعنی عدل و عفو، کرم، رزاقی و داد دہی۔ علیٰ ہذ القیاس۔ چنان چہ اس واسطے ان کے آداب میں لفظ عالم پناہ بمبالغہ تشبیہ مدحا مقرر ہوا کہ اس آگے بڑا تو اللہ کا نام ہے مگر مرتبہ عدل کا سب سے بڑھ کر ہے کہ ساری خصلتیں

اچھی اس کے پلّے میں تلی ہوئی ہیں بلکہ اگر پوچھو تو مصدر افعال ممدوحہ عدل ہے کہ اس سے در عین فنا نیک نامی کو بقا ہے۔ نوشیرواں کہ زندہ و قاروں بہ بیں کہ مرد۔ ایں ہر دو بر نام نشان است عدل را۔ پھر چاہئے تو یوں کہ حاکم عادل کی ذات سے پرورش جمہور انام ہو۔ چنانچہ ہوتی آئی ہے اور اب تو بخوبی ہوتی ہے بلکہ لولے لنگڑے، کوڑھی، اندھے، اپاہج، مریض، سائل، متوکل، رنڈی، مرد، بوڑھے بالے، مسافر مقیم جہاں تک ضعفا اس قلم رو میں ہیں سب کی قوت لایموت کی صورت ہے مگر ایک فرقہ اس حالت سے گرا ہوا بحالت تباہ، بنا امید کی کاٹا کیا بلکہ اپنے بہبود سے قطع نظر کر بیٹھا تھا کہ یک بہ یک یہ بات ان کے کانوں میں پہونچی کہ ایک امیر عظیم الشان، گردوں وقار، قیصر ساں بر و بحر، سلیمانِ مور پرور، رستمِ دوراں، بہادرِ گیتی ستاں اس ملک میں آتا ہے چنانچہ اس خبر کے سنتے ہی ان مردوں کو اعجازِ مسیحانے گویا دم دیا اور چشم براہ ہو بیٹھے اور اسکی ورد کی دعائے خیر میں مصروف ہو گئے کی اللہ تعالیٰ کے کرم سے اس آفتاب نے اس تیرہ ہند کو اپنی روشنی سے مشرف کیا اور اسے شکر ان بے چاروں نے سجدۂ شکر خدا کی جناب میں کیا اور اس امید پر ہو بیٹھے کہ شائد اس کے قدم کی برکت سے ہم کم بختوں کی نحوست کہیں دفع ہو۔ غرض جب وہ آیا اور متوجہِ امورات ہوا تب وہ صفتیں اس کی کہ جو سننے میں آئی تھیں ایک ایک کی ہزار ہزار ان میں سے نظر آنے لگیں اور اسے سن سن کر وے موئے مارے خوش وقتی کے پھولوں نہیں سماتے تھے اور انہیں یہ یقین بندھا کہ ہمارے دن بھلے آئے کہ ایسا حاکم عادل اللہ نے بھیجا۔ البتہ ہم ڈوبتوں کو یہی کنارہ ملے ہے گا۔ چنانچہ چوں گوش روزہ دار براللہ و اکبر ہو بیٹھے۔ اب اسے غور فرمایئے تو اس کی صفاتوں میں سے ایک بات یہ ہے کہ جب سے اللہ تعالیٰ نے اس ملکِ ہند کا زمامِ اختیار صاحبانِ انگریز بہادر کے ہاتھ میں دیا تب سے ہر طرح کی امنیت بہ عدل و انصاف بڑھتی ہی چلی آئی۔ جو سردار گردوں وقار کہ آیا ان نے سابق سے ملک کو زیادہ انتظام دیا اور جو لوگ کہ خواص اس ملک کے تھے ان میں سے جسے جسے لائق سمجھا اس سے ویسا ہی سلوک کیا اور جنھیں ناقص جانا ان سے ویسے کچھ کام نہ رکھا۔ چنانچہ یہاں کے عمدہ زادہ تو بیشتر علم و کمال سے ناقص ہی تھے پھر وہ تو خاک ہی میں مل گئے اور کہیں کے نہ رہے اور فرقہ ثانیہ نے میدان خالی پایا وعرصے میں آئے تو ان سے بھی بسا انکو اذیت پہونچتی چلی آئی کہ اس پر یہ

مسل (مثل) ہے کہ :

چو منعم کند سفلہ را روزگار نہد بر دلِ تنگِ درویش بار

کہ اس میں یہ امیر کبیر، سراپا عقل و تدبیر، گیتی ستاں و جہاں گیر، دریائے عیش، کانِ مروت، آفتابِ ذرہ پرور کے قدم کے آنے سے یہ ملک مشرف ہوا اور بیٹھتے ہی ان نے اول جلسے میں اس ملک کے لوگوں کا احوال دریافت کیا اور دیکھا کہ ایک عالم خدا کا بے روزی اور پریشان پڑا سسکتا ہے اور کوئی طرح ان کی پرورش کی بھی یہاں کے ضوابط کی صورت پر نہیں نظر آتی۔ غرض تجویز کرتے کرتے یہ بات ٹھہرائی کہ حکم مدرسی کا دیا اور یہ فرمایا کہ جہاں تک جوانانِ اہلِ ولایت ہمارے ہم چشم و ہم قوم اس ملک میں وارد ہوں اول داخلِ مدرسہ ہوں اور علم عربی و فارسی، ہندی، بنگلہ، ناگری وغیرہ سیکھیں اور تعلیم ہوں بعد اس کے حصول کے موافق ضابطہ خدماتوں پر مقرر ہوں۔ چنانچہ جب سے یہ حکم جاری ہوا اور یہ بات عمل میں آئی تب سے ہزاروں کی موجب پرورش ہو گئی اب اسے دھیان کیجیے کہ اس چالیس پینتالیس برس کی حکومت و تسلط میں کون سی بات ایسی مہمل رہ گئی تھی کہ جس کے واسطے یہ اخراجاتِ سنگین مقرر ہو۔ پھر یہ تو صاف مسل (مثل) آفتاب روشن ہے کہ محض رحم و کرم لطف و احسان خلق اللہ کے اوپر کیا اور کچھ نہیں۔ غرض ہم تو یہی سمجھے اور کی خدا جانے۔ سوا اس کے اور جتنی باتیں کہ لازمۂ سرداری و انتظامِ ملک داری کی تھیں وہ سب بخوبی عمل میں آئیں اور دن بدن آئی ہیں۔ مگر وے فلک زدہ، بدنصیب نجبا و امیر زادے کم بختوں میں سے جو کوئی کوئی کہیں مرتے کھپتے نیم جاں سسکتے ہوئے رہ گئے ہیں اب انہیں کی اصلاح باقی رہ گئی ہے مگر جب سے یہ امیر بادشاہ منش اس ملک میں آیا اور اسکی ذرہ پروری نے صورت پکڑی اور سبھوں کی آنکھوں میں گھر کیا اور بس گئے۔ تب سے یہ امیدوار ہو اس کے ذکر میں رطب اللسان ہیں :

اے لطف ترا جانب ہر ذرہ نگاہی در جانب ہر ذرہ بدر گاہ تو راہی
از ما کہ فلک بد شد و انداخت ز پایم بے سایۂ لطفِ تو نداریم پناہی

غرض سب کے سب اب تو اسی توقع پر تکی لگائے ہوئے ہیں کہ اگر خلیفۂ وقت امیر بیدار بخت لائق تاج و قابلِ تخت جود و کرم کا دریا، شجاعت و مروت میں یکتا و بے نظیر و خصلتوں میں بادشاہ

تدبیروں میں وزیر، نواب مع الالقاب فلک جناب ظفر رکاب مارکوئس ولیزلی گورنر جنرل لارڈ مارنگ ٹن بہادر کی اگر ایک نظرِ کیمیا اثر ہم بے پروخاک بسروں کے اوپر پڑ جاوے تو نہال ہو جاویں اور اس کے (کی) دریادلی کے ایک تموج میں ہم سب کا بیڑا پار ہو جاوے اور اس کے بھی دفترِ اوصاف سے یہ حرف مٹ جاوے اور یہ نکتہ پھل جاوے واللہ ہماری بدبختی تو دریا میں پیاسا مارے ڈالتی ہے اور یہ بھی یقین ہے کہ جواب نہ ہوا وہ کب ہوگا۔ اب سنو بھائی جی۔ اتنی بات جو مجھے یاد آ گئی تھی تمہاری خاطر سے میں نے کہہ سنائی پر خدا جانے کہ سننے والوں کی خاطر میں جگہ پاوے یا نہ پاوے مگر صاحبانِ عالی قدر کی قدر دانی سے دور نہیں کہ اس کے حسن و قبح کو دریافت کر کر جو لازمہ سرداری و انصاف ہے اسے اس بول چال کا حسنِ اختلاط سمجھیں۔ اب آؤ ہم تم دونوں مل کر اس کی دعائے خیر پر اس کہانی کو تمام کریں کہ جس کے عہد و حکومت میں اسے شروع کیا۔ الٰہی اس امیر، بادشاہ منش کو سلامت و با کرامت رکھ اور اس کا آفتابِ دولت و جاہ ہمیشہ وسطِ آسمانِ اقبال پر روشن و چمکتا رہے کہ اس کے وجودِ عالی کی ماروقار کی لنگر کی خاطر جمع سے کشتئ روزگار پر دور دور کے غربا و نجالوڑتے پڑتے سمندر کے کنارے پر دھونس کے دھونس بیٹھے اس کی شکرِ نعمت میں مصروف ہیں اور اللہ تعالیٰ کی جناب میں صبح و شام یہی عرض کرتے ہیں کہ الٰہی اس امیر کو مسل (مثل) آفتاب کے منور و مظفر رکھ۔

خدایا دعا میری توں کر قبول　　بحق محمد و آلِ رسول

مارکوئس ولزلی بہادر گورنر کے عہد میں یہ کہانی موسوم بہ حسنِ اختلاط اٹھارہ سو تین سال انگریزی چوتھی مئی بدھ کے دن چشمِ بددور کلکتہ میں حسنِ انجام کو پہونچی۔　الخیر فمادفع

●●●

کتابیات

۱۔ محمد عتیق صدیقی۔ گلکرسٹ اور اس کا عہد۔ دوسری اشاعت ۱۹۷۹۔ انجمن ترقی اردو ہند، دہلی۔

۲۔ ڈبلیو۔ ایچ۔ ٹن۔ بی۔ ڈی۔ مترجمہ مولوی محمد شوکت صاحب دہلوی۔ رولز آف انڈیا۔ اورنگ آباد، دکن۔ ۱۳۴۰ھ مطابق ۱۹۳۳ء۔

۳۔ لکشمی ساگر وارشنے۔ فورٹ ولیم کالج۔ الہ آباد یونیورسٹی۔ ۲۰۰۴ سمبت۔

۴۔ شری برجیندر ناتھ بندھوپادھیائے۔ فورٹ ولیم کالجیر پنڈت۔ (بنگلہ) بنگیہ ساہتیہ پریشد۔ کلکتہ۔ بیساکھ ۱۳۴۹۔

۵۔ محمد یحییٰ تنہا۔ سیر المصنفین (جلد اوّل)۔ محبوب المطابع، دہلی۔ ۱۹۲۴ء۔

۶۔ نادم سیتاپوری۔ فورٹ ولیم کالج اور اکرام علی۔ سرفراز پریس، لکھنؤ۔ ۱۹۵۹ء۔

۷۔ جاوید نہال۔ انیسویں صدی میں بنگال کا اردو ادب۔ اردو رائٹرز گلڈ۔ کلکتہ۔ ۱۲۔ سال اشاعت ندارد۔

۸۔ نثرِ بے نظیر۔ حبل المتین پریس۔ کلکتہ۔ ۱۹۰۲ء۔

۹۔ رسالہ گلکرسٹ۔ مرتبہ خلیل الرحمٰن داؤدی۔ مجلس ترقی ادب۔ لاہور۔

۱۰۔ ڈاکٹر سمیع اللہ۔ فورٹ ولیم کالج۔ ایک مطالعہ۔ نشاط آفسیٹ پریس، فیض آباد۔ ۱۹۸۹ء۔

۱۱۔ مرزا علی لطف۔ گلشنِ ہند۔ دار الاشاعت، پنجاب۔ ۱۹۰۶ء۔

۱۲۔ خوش معرکۂ زیبا۔ سعادت خاں ناصر۔ مرتبہ شمیم انہونوی۔ بار اول۔ ۱۹۷۱ء۔

۱۳۔ باغِ اردو۔ مرتبہ کلب علی فائق۔ ترقی ادب، لاہور، ۱۹۶۸ء۔

۱۴۔ آرائشِ محفل۔ کلکتہ پریس۔ ۱۸۷۱ء۔

۱۵۔ اردو کی نثری داستانیں۔ انجمن ترقی اردو۔ پاکستان۔ ۱۹۶۹ء۔

۱۶۔ تاریخ شیر شاہی۔ مرتبہ ڈاکٹر سید معین الحق۔ سلمان اکیڈمی۔ کراچی۔ ۱۹۶۳ء۔

۱۷۔ باغ و بہار۔ مرتبہ سلیم اختر۔ اعجاز پبلشنگ ہاؤس۔ نئی دہلی۔ ۱۹۸۹ء۔

۱۸۔ گنج خوبی۔ مطبع محمدی، کلکتہ۔ باہتمام غلام حیدر ساکن ہوگلی۔ ۱۲۶۳ھ/۱۸۳۶ء۔

۱۹۔ بنی نرائن جہاں۔ دیوانِ جہاں۔ قلمی نسخہ نمبر ۵۶۔ ایشیاٹک سوسائٹی آف بنگال۔

۲۰۔ عبد الغفور خاں نساخ۔ سخن شعراء۔ اترپردیش اردو اکادمی۔ ۱۹۸۲ء۔

۲۱۔ گلشنِ ہند۔ مرتبہ مختار الدین احمد۔ علمی مجلس، دہلی، ۱۹۶۷ء۔

۲۲۔ میر شیر علی افسوس۔ آرائش محفل۔ کلکتہ پریس۔ ۱۸۷۱ء۔

۲۳۔ خلیل علی خاں اشک۔ قلمی نسخہ انتخاب سلطانیہ۔ ایشیاٹک سوسائٹی آف بنگال۔

۲۴۔ شمس الرحمٰن فاروقی۔ ساحری، شاہی، صاحب قرانی۔ داستان امیر حمزہ کا مطالعہ، جلد اول۔ قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان۔ ۱۹۹۹ء۔

۲۵۔ خلیل علی خاں اشک۔ قصہ رضوان شاہ۔ قلمی نسخہ۔ ایشیاٹک سوسائٹی آف بنگال

۲۶۔ خلیل علی خاں اشک۔ دیباچہ قلمی نسخہ انتخاب سلطانیہ۔ ایشیاٹک سوسائٹی آف بنگال۔

۲۷۔ خلیل علی خاں اشک۔ جامع الاخلاق۔ مطبع محمدی۔ کلکتہ۔ ۱۸۴۸ء۔

۲۸۔ لطائف ہندی۔ للو جی لال۔

۲۹۔ تذکرہ خوش معرکہ زیبا۔ سعادت خاں ناصر۔ مرتبہ: ڈاکٹر شمیم انہونوی۔ نسیم بکڈپو لکھنؤ۔ ۱۹۷۱ء۔

۳۰۔ تذکرہ مخزن نکات۔ قیام الدین قائم چاند پوری۔ مرتبہ: اقتدا حسین۔ مجلس ترقی ادب لاہور، ۱۹۶۶ء۔

۳۱۔ تذکرہ مسرت افزا۔ ابوالحسن امیر الدین امر اللہ الٰہ آبادی۔ مرتبہ: عطا کاکوی۔ ۱۹۶۸ء۔

1. Spear, P. Oxford History of India.
2. Sahibs and Munshis, Sisir Kumar Das, Orion publications, Rupa & Co. First Pub. 1978.
3. Ranking , Bengal Past and Present, vii, 1911.
4. O'malley,L.S.The Indian Civil Service,London,1965.
5. Annals of the Collegeof Fort William,compiled by Thomas Roebuck, Garden Reach,Calcutta,1819.
6. The Calcutta Gazette (Extraordinary), 29 September 1800.
7. Carey, W.H.,The Good Old Days of Honorable John Company. R. Cambray & Co.,1907.
8. Ohdedar A.K. Appendix xiv, & 70., 1966.
9. The Dictionary of National Biography., vol-vii., ed by Sir Leslie Stephen & Sir Sidney Lee., Oxford University Press., 1950.
10. A History of Hindi Literature,F.E.Keay, Association Press,Calcutta, 1920.

●●●